۱۸۵۷ء

کوائف و صحائف

۱۸۵۷ء

کوائف و صحائف

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

مندرجات

دیباچہ

۱۸۵۷ء ہماری زندگی کی ایک اہم تاریخ ہے جو گزشتہ سو برس ہمارے ذہنوں میں برابر تازہ رہی اور آئندہ بھی بھولی نہ جا سکیگی۔ اس برصغیر کی پہلی عوامی جدوجہد، جس کا نام بیرونی حکومت کی مصلحت کے بموجب صرف ''غدر،، قرار پایا، اس سرزمین پر اپنی آزادی کو محفوظ کرنیکی آخری کوشش تھی جو ہم نے کی اور اپنے نتائج کے اعتبار سے بھی سب سے بڑھکر ہماری ہی تباہی کا موجب ہوئی اور ہم ہی مخصوصاً بیرونی حکومت کی داروگیر کا نشانہ بنے۔ یہ ہمارے عہد حکمرانی کا آخری باب تھا جو ہمارے خون سے لکھا گیا۔ ایک طرف یہ ایک سیاسی انقلاب تھا جس نے اس دور ملوکیت کو گویا اپنے طبعی انجام تک پہنچایا جس میں شہاب الدین غوری بلکہ محمد بن قاسم کی آمد سے لیکر مغلوں کے دودمان عالی شان تک بہت سے غلامان محمد، صاحب تاج و سریر اور اس برصغیر کے ہردلعزیز حکمراں رہے۔ دوسری طرف ہر سیاسی انقلاب کی طرح اس نے ہماری تہذیبی تاریخ کا بھی ایک نیا ورق الٹا۔ وہ معاشرہ جس میں پچھلی صدی کے وسط تک یہ تہذیب پھلتی پھولتی رہی منتشر ہوگیا، اور نئی شیرازہ بندی میں بعض جدید عناصر بھی لازماً داخل ہوئے جیسا کہ زمانے کا مقتضا تھا۔

یوں تو ۱۸۵۷ء کے واقعات ہماری ناکامی کا افسانہ ہیں لیکن زندہ قوموں کی تاریخ میں ایسے سانحات اکثر آتے ہیں۔ دیکھنے کے قابل یہی بات ہوتی ہے کہ انہوں نے ان سے کیا سبق لیا۔ اکثر مستقبل کی کامرانیوں کے سرے بھی وہیں سے شروع ہوتے ہیں جہاں ماضی کی ناکامی کا سلسلہ تمام ہوتا ہے۔ وہ قومیں جو قوت حیات سے بہرہ مند ہوں تاریخ کے چیلنج کو کبھی یوں بھی قبول کرتی ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی قربانیاں ۱۹۴۷ء میں رنگ لاتی ہیں۔

ہمارے لئے وہ تاریخ اور وہ دور بہرحال بہت اہم ہے جبکہ ہماری ملی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب رونما ہورہا تھا۔ یہ کتاب چند نشری تقریروں سے ترتیب دی گئی ہے جو ریڈیو پاکستان لاہور سے کی گئیں اور جن میں فاضل مقررین نے اس عہد کی ذہنی و سماجی زندگی کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، اور اس سلسلے میں بعض ایسی دستاویزات پر بھی نظر ڈالی ہے جن میں جنگ آزادی کا افسانہ مذکور ہے۔ ان صحائف میں اردو صحافت کے اولیں نمونے بھی شامل ہیں اور اردو نثر کے بعض نوادرات بھی، خصوصاً غالب کے مکاتیب، جنکی ادبی حیثیت مسلم ہے۔

ہم اس مفید و دلچسپ مجموعے کو بڑے فخر سے پیش کررہے ہیں اور جناب سید ذوالفقار علی بخاری، ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان، کے ممنون ہیں کہ انہوں نے یہ مضامین ہمیں اشاعت کے لئے عنایت فرمائے۔

*

مذہبی رجحانات

(غلام رسول مہر)

جنگ آزادی جسے غیر ملکیوں کے دور اقتدار میں ''غدر،، کے نام سے شہرت دی گئی بجائے خود ہمارے بر عظیم کی تاریخ کا بہت بڑا واقعہ نہ تھی لیکن نتائج و عواقب کے اعتبار سے اس جنگ کو ہماری تاریخ کے اہم ترین واقعات میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ اجنبی اقتدار کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے کی ایک نہایت پر خلوص کوشش تھی۔ اگرچہ بعض اتفاقی حوادث و سوانح کی بنا پر، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ایسے کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اس لئے بھی کہ اس جنگ کے نتیجے میں ہمارے تمدن، ہماری سیاست، ہماری ثقافت، ہمارے مذہبی رجحانات اخلاق و عادات اور زندگی کے تمام دوسرے شعبوں پر گہرا اثر پڑا۔ میں اپنی بات چیت صرف مذہبی رجحانات تک محدود رکھونگا۔

غیر ملکی اقتدار کی توسیع کے ساتھ ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے لئے جو خطرے پیدا ہوئے ان میں سے تین خطرے جنگ آزادی کے بعد نہایت خوفناک شکل میں سامنے آچکے تھے۔ ایک طرف مسیحی مشنری تھے جن کے حملے سب سے بڑھکر اسلام پر ہورہے تھے۔ اولاً اس لئے کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں پر سخت ضرب لگ چکی تھی۔ ان کا برائے نام اقتدار بھی ختم ہوچکا تھا اور وہ انگریز حاکموں کے نزدیک معتوب ہونے کے باعث سخت پریشان

حال تھے۔ اس حالت میں ان کے مذہب کو ھدف بنالینا مشنریوں کو سہل بھی نظر آیا اور نتیجہ خیز بھی۔ ثانیاً بعض مشنری سمجھتے تھے کہ اگر وہ، معاذ اللہ، اسلام کو شکست دینے میں کامیاب ھوجائیں گے تو پھر کوئی دوسرا مذہب ان کے مقابلے پر ٹھہر نہ سکیگا۔ تیسرے انگریزوں نے مسلمانوں کے ھاتھ سے اقتدار چھینا تھا، انہیں یقین تھا کہ مسلمان ھی انکے خلاف اٹھنے کی ھمت رکھتے ھیں۔ لہذا مسلمانوں کی سیاسی شکست کو مکمل و فیصلہ کن بنانے کے خیال سے ان کے مذہب پر اعتراضات کا سیل بہا دیا گیا۔ مشنریوں کی ان کوششوں کے خلاف متعدد مذہبی عالموں نے مردانگی سے جہاد کا سرو سامان کیا جن میں مولانا رحمت اللہ مرحوم و مغفور بانی مدرسہ صولتیہ (مکہ معظمہ) اور ڈاکٹر وزیر خاں مرحوم کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ھیں۔ سرسید مرحوم و مغفور نے اس سیل کی روک تھام اور اسلام اور مسلمانوں کے بچاؤ کے لئے جو مجاھدانہ کارنامے انجام دئے ان کا سرسری ذکر میں آگے چل کر کرونگا۔

دوسرا خطرہ یہ تھا کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا۔ طبعاً مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نہایت سخت ملال تھا اور انگریز چونکہ مسلمانوں اور صرف مسلمانوں ھی سے خائف تھے اس لئے نظم و نسق ملک میں ان پر اعتماد کے لئے تیار نہ تھے۔ جنگ آزادی میں مسلمانوں نے نمایاں حصہ لیا اسلئے انگریزوں کو یقین ھوچکا تھا کہ مسلمان کبھی ان سے تعاون نہ کریں گے۔ یوں ایسی صورت پیدا ھوگئی تھی کہ انگریزوں کے دور اقتدار میں مسلمان نظم و نسق میں حصہ داری سے محروم ھوکر اس پستی میں گرجاتے جس میں ھزاروں سال سے اچھوت گرے ھوئے تھے۔ تیسرا خطرہ یہ تھا کہ انگریزی اقتدار کی بنیادیں مضبوط ھونے کے بعد انگریزی تعلیم جاری ھوگئی تھی اور روز بروز اسکا دائرہ پھیل رھا تھا۔ مسلمان چاھتے بھی تو اس تعلیم سے بالکل بے تعلق نہ رہ سکتے تھے۔ اگر وہ انگریزی تعلیم

پائے تو اندیشہ تھا کہ ان کے مذہبی معتقدات پر بہت برا اثر پڑے گا۔ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ دور زوال میں مذہبی معتقدات بھی بڑی حد تک بگڑ چکے تھے۔ صحیح دینی تعلیم کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تھا۔ ان حالات کا طبعی نتیجہ یہ ہوتا کہ انگریزی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ مشنریوں کے لئے مسلمانوں میں اشاعت مسیحیت کا راستہ صاف ہو جاتا۔

سرسید مرحوم وہ بزرگ تھے جنھیں تینوں خطروں کا پورا احساس ہوا اور سنہ ۵۷ء سے زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے جو کچھ کیا اس کا مقصد یہی تھا کہ ان تینوں خطروں کا انسداد ہو یعنی:

مشنریوں کے اعتراضات کے محض الزامی جوابات پر قناعت نہ کرلی جائے بلکہ تحقیقی اور علمی جوابات دئے جائیں اور اس سلسلے میں اسلام کی برتری محکم حقائق کی بنا پر ثابت کی جائے۔ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان بے اعتمادی اور بد ظنی کی جو خلیج حائل ہوچکی تھی اسے پاٹا جائے تا کہ مسلمان اس سر زمین میں ایک معزز قوم کی حیثیت میں ملکی نظم و نسق کے حصہ دار بن سکیں۔ ان کے لئے انگریزی تعلیم کا ایسا انتظام کیا جائے کہ ان کی اسلامیت نہ صرف محکم و پائیدار بن جائے بلکہ ان میں اسلام کی حقانیت و افضلیت کا سچا جذبہ اور جوش پیدا ہوجائے، ان کو صرف رسمی اور موروثی حیثیت ھی میں مسلمان نہ سمجھا جائے بلکہ وہ حقیقی معنوں میں پر جوش مسلمان بن جائیں۔

مسلمان اگر انگریزی تعلیم سرکاری درسگاھوں یا مشن سکولوں اور کالجوں میں پائے تو سخت خطرہ تھا کہ ان کے اسلامی عقائد پر اچھا اثر نہ پڑے گا۔ لہذا سرسید نے اپنے زیر اہتمام ایک معیاری درسگاہ قائم کرنے کا ارادہ فرمایا۔ جہاں مسلمانوں کو بہتر مسلمان بنانے کا پختہ انتظام موجود ھو۔ اس ارادے نے علی گڑھ کالج کی شکل اختیار کی اور کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ سرسید کی یہ سکیم بہ اعتبار نتائج بہت کامیاب ہوئی اور

علی گڑھ کے نمونے پر مسلمانوں نے جا بجا جتنی درسگاہیں قائم کیں انکی خدمات جلیلہ روز روشن کی طرح سب پر آشکارا ہیں۔

اسی سلسلے میں سرسید نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ اسکا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پائیں انکے سامنے مذہب کو نئی عقلیت کے نقطۂ نگاہ سے معقول طریق پر پیش کیا جائے۔ پیش نظر موضوع اس امر کا متحمل نہیں کہ سرسید مرحوم کی تفسیر پر مخالف و موافق بحثوں کا جائزہ لیا جائے۔ صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ سرسید نے اس سلسلے میں جو قدم اٹھایا وہ ان کے اختیار کردہ مسلک کا ایک لازمی حصہ تھا۔ جن اصحاب کو بعض مسائل و امور میں ان سے اختلاف رہا وہ بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ سرسید نے ایک نہایت ضروری اور اہم کام انجام دیا اور اس کے فوائد مضرتوں سے یقیناً زیادہ تھے۔

علی گڑھ کالج کے خواب کو جامۂ عمل پہنانے سے پیشتر سرسید نے بائبل کی تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی۔ خواجہ حالی کے بیان کے مطابق وہ عہد عتیق میں سے کتاب پیدائش کے گیارھویں باب تک پہنچے تھے اور اسلوب یہ اختیار کیا تھا کہ بائبل کے جو بیانات قرآن مجید کے مطابق تھے ان کی توضیح کرتے۔ جہاں اختلاف نظر آتا اسکی وجہ بیان فرماتے، اور اسلام کی محکمیت ثابت کرتے۔ اس کوشش کا مقصد بھی یہی تھا کہ اختلافات کے بجائے موافقات سامنے آئیں اور انہیں پر توجہ مرتکز ہو۔ اجنبیت کی خلیج کو پاٹنے کی یہ بھی ایک شکل تھی۔ اس سے ہمارے الہامی مذاہب کے تقابلی مطالعے کی بنیاد پڑی۔ یہ سلسلہ دینی مقاصد کی پیش برد کے لئے بے حد مفید تھا۔

علماء کرام کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو ہر قسم کی سیاسی مشکلات کے باوجود انگریزوں سے تعاون کا روا دار نہ ہوا۔ انہوں نے جابجا خالص دینی درسگاہیں قائم کیں تاکہ مسلمانوں میں دینی حمیت کو زندہ رکھیں اور ان کے لئے ان سے استفادے

کے مواقع بہم پہنچائیں جو دین کے حقیقی سرچشمے تھے اور زوال
کے بعد ان کے بہرہ مندی کے مواقع بڑی حد تک ختم ہوچکے تھے۔
اس سلسلے میں بہت سی درسگاہوں کے نام لئے جاسکتے ہیں
جو اس بر عظیم کے طول و عرض میں جابجا قائم ہوئیں اور اب
تک موجود ہیں۔ اس سلسلے کی جس درسگاہ نے سب سے بڑھکر
شہرت پائی وہ دیوبند کی درسگاہ تھی۔ اسکی بنیاد حضرت مولانا محمد
قاسم صاحب رح اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح نے رکھی۔
یہ بالکل معمولی سرو سامان کے ساتھ شروع ہوئی تھی۔ لیکن
بانیوں کے اخلاص اور حب اسلام کی بدولت اس بر عظیم کی بہت
اہم دینی درسگاہ بن گئی۔ حضرت مولانا محمد قاسم، دین اسلام
پر مخالفوں کی نکتہ چینیوں کے جوابات دیتے رہے۔ خواہ وہ نکتہ
چینیاں مسیحیوں کی طرف سے ہوں یا دوسرے مذاہب کے پیروؤں
کی طرف سے۔ اس سلسلے میں ان کی تصانیف اور تحریریں ادب
اسلامیہ کا ایک گراں قدر سرمایہ ہیں۔

علیگڑھ اور دیوبند بظاہر دو مختلف قسم کی درسگاہیں تھیں
لیکن ان دونوں نے مسلمانوں کی دینی و دنیوی، علمی و سیاسی
اور اخلاقی و ثقافتی میراث کو بہتر سے بہتر طریق پر محفوظ رکھنے
کی جو کوشش کی اسکی مشکوریت سے کیسے انکار ہوسکتا ہے۔
جو مسلمان ۱۸۵۷ء میں بظاہر اپنا سب کچھ کھوچکے تھے
وہ تھوڑی ہی مدت میں سنبھل کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہوگئے۔
پھر اسی سرگرمی سے آگے بڑھے اور از سر نو ایک زندہ، غیور
اور مجاہد قوم بن گئے۔ جزوی یا بعض معاملات میں کوتاہیوں سے
قطع نظر کرتے ہوئے جن سے کسی قوم کو بھی زندگی کے
مختلف مراحل میں مفر نہیں، اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا
ہے کہ جن مسلمانوں کے متعلق ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد
سمجھا جاتا تھا کہ وہ اب ہمیشہ کے لئے ختم ہوچکے ہیں،
وہ نہ صرف اٹھے بلکہ اس وسیع سر زمین کی تعمیر میں بہت اہم
وظیفہ بجا لانے کے قابل بن گئے۔ حالانکہ انہیں کسی دائرے

میں وہ وسائل مہیا نہ رہے تھے جو اس ملک میں ایک ہزار
سال سے زیادہ مدت تک انکی قومی میراث بنے رہے۔

ان دینی اور قومی مجاہدوں کی فہرست بہت طویل ہے جنہوں
نے ۱۸۵۷ء کا خونیں دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ نتائج
سے متاثر ضرور ہوئے ہوں گے لیکن نہ اسلام پر ان کے ایمان
کی پختگی میں فرق آیا نہ انکے قدم ہمت میں لغزش پیدا ہوئی۔
نہ ان کی غیرت و حمیت کی حرارت میں افسردگی آئی۔ نہ وسائل
کا فقدان ان کا دامن گیر ہوسکا۔ وہ اپنے فرض کو پہچانتے ہوئے
اٹھے اور انہوں نے عمل کے جو راستے ہموار کردئے تھے ان
پر چلنے کے لئے پوری قوم میں نیا جوش پیدا کردیا۔ انہی
بزرگوں کے پر خلوص کارناموں کی برکت تھی کہ مسلمانوں نے
حقیقی مذہبی میراث کے تحفظ کو اپنا نصب العین بنایا۔ باقی
رہا یہ امر کہ ہم اس میراث کی عظمت و جلال کو بحال رکھنے
میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں یا کامیاب ہوں گے تو اس
بارے میں فیصلہ کا حق حال کے نہیں بلکہ مستقبل کے ہاتھ
میں ہے۔

تعلیم

(ڈاکٹر محمد باقر)

جنگ آزادی کا اثر تعلیم پر کیا ہوا، اس کا جائزہ لینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ سن ستاون کے انقلاب سے پہلے ہمارا نظامِ تعلیم کیا تھا۔ اس سلسلے میں اب تک جو تحقیق ہو چکی ہے وہ اس امر کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ جنگ آزادی سے پہلے اور جنگ آزادی کے بعد تک مدارس اور درسگاہوں کا ایک غیر منظم سلسلہ پنجاب سے لیکر بنگال تک پھیلا ہوا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں مصر سے ایک کتاب "صبح الاعشیٰ" کے عنوان سے بارہ جلدوں میں شائع ہوئی تھی جو مختصر سمجھیے تو اس عہد کا انسائیکلوپیڈیا تھا۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب ہندوستان میں خاندانِ تغلق حکمران تھا۔ اس میں درج ہے کہ صرف ہند کے پایۂ تخت دلی میں ایک ہزار مدرسے قائم تھے۔ اس زمانے میں تعلیم کے لئے عموماً علیحدہ عمارتیں نہیں ہوتی تھیں۔ زیادہ تر یہ کام مساجد سے لیا جاتا تھا۔ اور تمام مسجدیں مدرسوں کا کام دیتی تھیں۔ اسلئے ہر قدیم مسجد ایک بڑی درسگاہ تھی۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان کے قدیم اسلامی شہروں میں قدم قدم پر ہم کو وسیع اور شاندار مسجدیں ملتی ہیں۔ دلی، آگرہ، لاہور، جونپور، احمد آباد، گجرات وغیرہ قدیم اسلامی دارالسلطنت میں جو عظیم الشان مسجدیں تعمیر ہوئی تھیں وہ اب تک

باقی ہیں ان کی ہیئت کذائی صاف بتاتی ہے کہ ان کا بڑا حصہ تعلیم گاہوں کے کام آتا تھا۔ ان مسجدوں میں اب تک صحن کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے حجروں کا وسیع سلسلہ نظر آتا ہے جو درحقیقت طلبا اور معلمین کے رہنے کے مقامات تھے۔ قدیم خانقاہیں بھی تعلیم گاہوں کے مصرف میں آتی تھیں۔ سلاطین اور بزرگان کرام کی قبروں پر جو مقبرے اور روضے تعمیر ہوتے تھے ان کے ساتھ ارد گرد بہت سے حجرے اور کمرے اسی غرض سے تعمیر ہوتے تھے کہ وہ مدرسوں کے کام آئیں۔

اجمالی طور پر یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان درسگاہوں میں نصاب تعلیم کیا تھا۔ میں صرف وہی نصاب عرض کرونگا جو جنگ آزادی سے معاً قبل رائج تھا کیونکہ اس سے پہلے نصاب تبدیل بھی ہوتا رہا ہے۔ اسلامی درسگاہوں کے نصاب میں جو فنون اور کتابیں شامل تھیں انکی تفصیل یہ ہے:

صرف و نحو، بلاغت، ادب، فقہ، اصول فقہ، منطق، حکمت، کلام ریاضی، فرائض، مناظرہ، تفسیر اصول حدیث، حدیث۔ اس نصاب کو پڑھنے کے لئے جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں انکا ذکر کروں تو بات لمبی ہوجاتی ہے۔ بہر صورت مختصر طور پر یہ نظام تعلیم جنگ آزادی سے پہلے رائج اور مقبول تھا۔

سن ستاون کے ہنگامے کے بعد جب انگریزوں کے قدم ہندوستان کی سرزمین میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے تو مسلمان مفکرین کو محسوس ہوا کہ اب سیاسی زوال و انحطاط کے ساتھ مسلمانوں کے دین و مذہب اور ان کی قومی زندگی کی بھی خیر نہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمان ارباب فکر و علم نے سب سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی، لیکن ارباب فکر کے دو طبقے ہوگئے ایک طبقہ جو علماء کرام کا تھا، اس نے اپنی تمام تر توجہ قدیم نصاب درس کی تعلیم پر مرکوز کردی۔ اسی مقصد کے لئے عربی مدارس قائم کئے گئے اور ان کے ذریعے دینیات یعنی تفسیر حدیث، فقہ اور ان کے ساتھ عربی زبان سے متعلق علوم و فنون

کی تعلیم کا ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے برخلاف
دوسرا طبقہ متجددین کا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کی
بہتری اسی میں سمجھی کہ مسلمان انگریزوں کی زبان اور ان
کے علوم و فنون سیکھیں۔ بلکہ تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے بھی
انہیں کے رنگ میں رنگے جائیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی
کوشش خان بہادر نواب عبداللطیف نے کی جنہوں نے سن ۱۸۶۳ء
میں (Mohammadan Literary Society) کے نام سے کلکتہ
میں ایک انجمن کی بنیاد رکھی جس میں شہر کے متوسط اور امیر
طبقہ کے لوگ جمع ہوکر مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل پر غور
کرتے اور انگریزی کی تعلیم و تبلیغ کا احساس اپنے اراکین کو دلاتے۔
چنانچہ اس انجمن کی مساعی اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ جلد
ہی کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں انگریزی نصاب میں داخل ہوگئی۔
اس انجمن کی شہرت اور مقبولیت سے ملک کے دوسرے شہروں
میں بھی انگریزی کی تعلیم کے رواج کا پرچار ہوا اور وہاں
بھی اس قسم کی انجمنیں معرض وجود میں آئیں۔ اب سوال یہ تھا
کہ کس قسم کی تعلیم کو رواج دیا جائے اور لوگوں کو تعلیم
دینے کے لئے کس قسم کے ادارے قائم کئے جائیں۔ مسلمان جب
سن بغاوت کے عالم میں تھا تو انگریز یہاں تسلط جمانے اور اقتدار
مستحکم کرنے کی فکر میں تھے۔ اس لئے اس نے سب سے پہلا کام یہ
کیا کہ قدیم مدارس اور تعلیم گاہوں سے قطعی لاتعلقی کا اظہار
کیا۔ ان درسگاہوں کے معلموں کو پہلے بادشاہ سے لیکر مقامی
حکمرانوں تک سے وظائف اور مشاہرے ملتے تھے لیکن جب حکمران
ہی بدل گئے تو ان کی خدمات کا معاوضہ کون دیتا۔ نتیجہ یہ کہ
پرانی قسم کی درسگاہیں از خود اپنے دروازے بند کرنے لگیں
اور ان کے طالب علم یا تو جہالت اور گمنامی کی نذر ہوگئے یا
نئے قسم کے سکولوں میں جانے لگے جن کی تعداد بہت کم تھی۔
سن ۱۸۵۹ء میں حکومت ہند نے جو اصلاح حکومت انگلستان
کو ہندوستانی تعلیم کے متعلق بھیجی ہے اس میں لکھا ہے:

"غربا سکولوں میں جانا پسند ہی نہیں کرتے کیونکہ وہ اتنے مفلس ہیں کہ سکول کی فیس ادا نہیں کرسکتے اور ان کے والدین انکی مزدوری سے ان کے لئے نان و نفقہ بہم پہنچاتے ہیں۔ متوسط طبقے کے لوگ اور امرا صرف انگریزی طرز کے سکولوں کے لئے کچھ قربانی کرنے کے لئے تیار ہیں"۔ نتیجہ یہ کہ انگریزوں نے سرکاری طور پر اور عیسائی مبلغین کے زیر اہتمام ہندوستان میں پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول کھلوائے، لیکن قدیم درسگاہوں کے مقابلے میں ان کی تعداد کم تھی۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ ۱۸۸۲ء میں سارے بنگال میں صرف ۱۵۶ ہائی سکول تھے جو حکومت انگلشیہ کی زیر نگرانی کھلوائے گئے تھے۔ حکومت ہند نے ۱۸۵۷ء میں یونیورسٹی ایکٹ بھی پاس کیا اور ہندوستان میں یونیورسٹیاں بھی کھلنے لگیں۔ سب سے پہلی یونیورسٹی ۲۴-جنوری ۱۸۵۷ء کو کلکتے میں قائم ہوئی اور اسی سال ۱۸-جولائی کو بمبئی یونیورسٹی کھلی۔ لیکن یہ سارا دھندہ اس قسم کا تھا جس میں انگریزی تو مقبول ہوئی اور انگریزی تعلیم سے لوگ فیضیاب ہوئے لیکن لکھنے پڑھنے والے لوگ دن بدن کم ہوتے گئے۔ اور ان پڑھ عوام کی تعداد بڑھتی گئی۔

۱۹۳۱ء میں حکومت ہند نے جو تعلیمی رپورٹ شائع کی تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں صرف ۹، فیصدی مرد اور ۳ فیصدی عورتیں پڑھ لکھ سکتی تھیں۔ وجہ ظاہر ہے۔ ایک تو یہ کہ اس وقت تک ہندوستان کی بیشتر نئی درسگاہوں میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہوگیا تھا، جو غیر ملکی زبان تھی اور جسے سیکھنے کے لئے طلبا کا کافی وقت صرف ہوجاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ تعلیم کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔ تیسرے یہ کہ درسگاہوں کی تعداد بہت کم ہوگئی تھی۔ جنگ آزادی سے پہلے اجمیر، دہلی، پنجاب، نارنول، آگرہ فتح پور سیکری، متھرا، بروار، بدایوں، دارا نگر، رامپور روہیلکھنڈ، اودھ، الہ آباد، فرخ آباد، جونپور، غازی پور، بہار، بنگال، دکن

مالوہ، اُچھ، ملتان، کشمیر، گجرات، سورت، اور لاہور میں، جہاں ہمیں
ہزاروں درسگاہوں کے نشان ملتے تھے، وہاں اب ہر صوبے میں اور
وہ بھی صرف بڑے بڑے شہروں میں چند درجن مدرسوں کی تعداد
ملتی ہے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے۔ قدیم و جدید درسگاہیں
ایک نہ ایک ضرورت کی تکمیل کرتی تھیں۔ لیکن افسوس ناک
امر یہ تھا کہ دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک رہی یہ
ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم تعلیم یافتہ حضرات کو جدید
گروہ سے نفرت تھی اور اسی طرح جدید گروہ قدیم تعلیم کے اصحاب
سے بیزار تھا۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کا زور ہوا تو اس نے سب کو
ایک پلیٹ فارم پر لا کر کھڑا کردیا اور اس میل جول کا نتیجہ
یہ ہوا کہ دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کے معائب و محاسن
کو قریب سے دیکھا اور نیک نیتی سے اپنے اپنے لائحہ عمل کی
اصلاح چاہی۔ انہیں اس مقصد میں کامیابی ہوئی یا نہیں لیکن
ایک بات ضرور ہے کہ ان میں ملاپ سے چند اور نئی قسم کی
درسگاہیں معرض ظہور میں آگئیں۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
سے اصلاح کا جو نعرہ بلند ہوا اس کی بدولت جامعہ ملیہ اسلامیہ
نے جنم لیا، اور نصاب عربی اور قدیم علوم میں اصلاح کا جو مطالبہ
پیدا ہوا اسکے اثرات ندوۃالعلماء میں ظاہر ہوئے۔ گو اب بھی
ان مدارس اور ان کی صلاحیت کا جائزہ لیا جائے تو ایک بات بار بار
سامنے آتی ہے کہ ملک میں جنگ آزادی کے بعد ناخواندگی روز
بروز بڑھتی ہی گئی اور پڑھے لکھے لوگ کم ہوتے ہی گئے،
گو کالج اور یونیورسٹیوں کے گریجویٹوں کی تعداد روز افزوں تھی۔

۱۹۳۸ء میں جواہر لعل نہرو کشمیر گئے تو ان کی
ایک تقریر کے موقعہ پر غالباً انگریزی راج کی برکت کے اعداد
و شمار سے سمجھایا گیا تھا اور ملک کے بڑے بڑے ٹکڑوں پر
سرداری لیڈروں کے حوالے سے یہ نکتہ بتایا گیا تھا کہ جنگ
آزادی کے بعد ہندوستان میں مختلف قسم کے امراض سے کسی

اموات سالانہ ہوتی ہیں، اجناس کے نرخ کس قدر بڑھ گئے ہیں، دستکاروں اور علوم کے ماہرین کی تعداد کس قدر کم ہوگئی ہے اور اس موقعہ پر ایک اشتہار میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ جنگ آزادی کے بعد درسگاہوں کی تعداد کس قدر کم ہوگئی ہے اور ناخواندگان کی تعداد کس قدر بڑھ گئی ہے۔ جب یہ اعداد و شمار انگریز حاضرین نے دیکھے تو حیرت سے منہ میں انگلیاں چبانے لگے۔ ہمارے کئی انگریز دوستوں نے ہم سے پوچھا کیا یہ حقیقت ہے؟ لیکن ہمارے پاس اس کا جواب اثبات کے سوا کیا تھا۔ کیونکہ انگریز کے ترتیب دئے ہوئے اعداد و شمار خود ہی بول رہے تھے کہ انگریزی نظام تعلیم نے ملکی نظام تعلیم کا قلع قمع کرکے اس کا کوئی مناسب بدل پیش ہی نہیں کیا تھا۔ جس سے خواندگان کی تعداد بڑھ سکتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ مدارس اور ذہنوں کا یہ غوغائے روا رو حکیم الامت کی زبان میں ابھی تک توجہ کا از حد محتاج ہے۔

سیاسیات

(از شکور احسن)

۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام رہی تو ہندوستانیوں پر ہولناک مظالم کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ مسلمان خاص طور سے اس مشق ستم کا نشانہ بنے۔ اس لیے کہ انگریز نے حکومت ان سے چھینی تھی اور اسے ان سے انتہا پسندی کا شکوہ تھا۔ جنگ آزادی سے چودہ برس پہلے ہندوستان کے گورنر جنرل نے یہ کہہ دیا تھا کہ مسلمان بنیادی طور پر ہمارے مخالف ہیں اور اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ۵۷ء کی ناکام جدوجہد کے بعد انگریز نے اس مخالفت کا جی بھر کر بدلہ لیا۔ ان کے رہنماؤں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ ان میں شہزادوں سے لیکر عالموں اور شاعروں تک سبھی شامل تھے۔ سرولیم میور نے اپنی کتاب (تعاون ہند) میں بعض خفیہ دستاویزوں کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۸ نومبر ۵۷ء کی صبح کو چوبیس شہزادوں کو دہلی میں تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ جن میں بادشاہ کے داماد، برادران نسبتی، بھانجے اور بھتیجے شامل تھے۔ جھجھر بلب گڑھ فرخ نگر اور فرخ آباد کے رؤسا نے جنگ آزادی میں بہت نمایاں حصہ لیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے بعض کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔ اور بعض کو عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ مسلمان بستیوں کو اجاڑنے کی منظم کوشش کی گئی، ان میں ایک یہ

بھی تھی کہ فتح پور پر، جس نے بغاوت میں حصہ لیا تھا،
حملہ کیا جائے۔ شہابیوں کے محلے تباہ و برباد کردئے جائیں،
اور ان کے تمام مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔
دہلی میں جنگ کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کو ایک عرصہ تک
دوبارہ بسنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مرزا غالب کے بعض خطوط
سے مسلمانوں کی بے چارگی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک خط میں یوں
لکھتے ہیں: "دلی کہاں، ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا
تھا۔ اہل اسلام میں صرف تین آدمی باقی ہیں میرٹھ میں مصطفیٰ
خاں، سلطان جی میں مولوی صدر الدین، بلی ماراں میں سگ
دنیا موسوم بہ اسد۔ مردود، مطرود، محروم"۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں سب
فرقے اور قومیں دل و جان سے شریک ہوئیں لیکن جیسا کہ اشوک
مہتہ نے اپنی کتاب ('عظیم الشان بغاوت') میں لکھا ہے مسلمان
تاریخی اور نصب العینی تقاضوں کے تحت انگریز دشمنی میں
ہندوؤں سے بے انتہا آگے تھے، ان میں سے اکثر پر شاہ ولی اللہ کی
تعلیمات اور سید احمد شہید کے مجاہدانہ کارناموں کا بڑا گہرا
اثر تھا اور وہ ہندوستان کو غیر ملکی اقتدار سے پاک کرکے ایک
اپنی حکومت کا قیام چاہتے تھے۔ چنانچہ جنگ آزادی میں عالموں
کی جماعت پیش پیش رہی۔ جنگ میں نہ صرف مسلمانوں کو
زیادہ قربانی دینی پڑی۔ بلکہ انہوں نے جنگ کے بعد بھی شکست
کا اعتراف کرنے سے انکار کیا۔ اور ایک عرصہ تک اپنی جد و جہد
جاری رکھی۔ ۱۸۶۳ء میں انگریزوں کو سید احمد شہید کے
معتقدوں سے آزاد سرحد پر ایک خوفناک جنگ لڑنی پڑی۔ اور
انگریز کے خلاف قبائلی علاقہ سے لیکر پٹنہ تک بغاوت کی ایک
منظم تحریک جاری رہی جسے بعد میں نہایت بے رحمی سے کچلا
گیا۔ اور اس تحریک کے علمبرداروں میں سے جن میں
مولانا یحییٰ علی اور مولوی محمد جعفر کا نام خاص طور سے
قابل ذکر ہے، بعض کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

وحشت اور درندگی کا جو دور ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا وہ مسلسل دس بارہ برس تک جاری رہا۔ جس نے بالآخر مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کردیا۔ اور پوری قوم پر مایوسی اور افسردگی کا احساس غالب آگیا۔ البتہ انگریز سے دشمنی اور نفرت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے انگریزی پڑھنے سے بھی انکار کردیا۔ عین اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت سرسید احمد خاں نے اپنے ہاتھ میں لی۔ سرسید کا عقیدہ یہ تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں نئی پالیسی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان تعلیم میں پیچھے رہ گئے ہیں۔ اقتصادی طور پر ان کی یہ حالت تھی کہ ان کی زمینداریاں ختم ہوچکی تھیں اور وہ سرکاری ملازمتوں سے محروم تھے۔ تجارت کے میدان میں پہلے ہی ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ چنانچہ سرسید کے خیال میں قوم کو ورطۂ ذلت سے نکالنے کا علاج صرف تعلیم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے اپنی تمام کوششیں علیگڑھ کالج بنانے اور معاشرت کی اصلاح کرنے کے لئے وقف کردیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سیاسی معاملوں سے بے خبر تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ علیگڑھ کی پوری تحریک کا پس منظر سیاسی تھا۔ تعلیم ان کی نظر میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا ایک وسیلہ تھا اور وہ یہ لکھتے تھے کہ مسلمان اسی وقت سیاسی اقتدار حاصل کرسکتے ہیں کہ پہلے ان میں تعلیم کا چرچا ہو اور ان میں قومیت کا احساس اور بلند نظری پیدا ہوجائے۔ سرسید ملکی مسائل میں اتحاد عمل کے حامی تھے اور اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جب وہ ۱۸۸۴ء میں لاہور آئے تو برہمو سماج اور آریہ سماج کے ایک متفقہ وفد نے ان کی خدمات کو سراہا۔ ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر ان کی متعدد تقریریں موجود ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں انہیں سب سے پہلے مایوسی اردو ہندی کے جھگڑے پر ہوئی۔ اس سلسلہ میں خود ان کے یہ الفاظ زبردست پیشگوئی کی حیثیت رکھتے ہیں: ''اب مجھکو یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں

کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیگی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا،،۔

دونوں قوموں میں نفاق کی جو صورت پیدا ہوگئی تھی اس کا بیج بونے میں برطانوی حکومت نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ مثال کے طور پر جنگ آزادی کے فوراً بعد مراد آباد کے کمان دار لفٹیننٹ کرنل جوھن کوک نے اپنے ایک مراسلہ میں ایک جگہ لکھا کہ حکومت ہند کو لڑانے اور حکومت کرنے کی پالیسی پر عمل کرنا چاہئے۔ ۱۴۔مئی ۱۸۵۹ء کو بمبئی کے گورنر لارڈ الفنسٹن نے ایک تحریر میں یوں اپنے خیال کا اظہار کیا تھا: ''لڑا کر حکومت کرنا رومیوں کا شیوہ تھا، اور یہی شیوہ ہمارا بھی ہونا چاہئے،،۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرسید کی انتہائی کوششوں کے باوجود ہندوستانیوں میں اتحاد عمل اور اتحاد مقاصد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ ۱۸۸۵ء میں جب لارڈ ڈفرن ہندوستان کے وائسرائے ہوئے تو انہوں نے انڈین سول سروس کے ایک ریٹائرڈ افسر مسٹر ہیوم کو اس بات کی دعوت دی کہ ایک ایسی انجمن منظم کرے جو حکومت سے تعاون کرسکے اور اسے صلاح مشورہ دے سکے۔ اس انجمن کا نام انڈین نیشنل کانگرس رکھا گیا۔ اس کا پہلا اجلاس بمبئی میں ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ اپنے ابتدائی مرحلوں میں حکومت برطانیہ سے وفاداری کانگریس کا شعار تھا۔ اور یکے بعد دیگرے اس کے مختلف لیڈر مثلاً دادا بھائی ناروجی۔ بدر الدین طیب جی اور فیروز شاہ، اپنے صدارتی خطبوں میں حکومت برطانیہ سے وفاداری اور نیازمندی کا دم بھرتے رہے۔ سرسید نے شدت سے یہ محسوس کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کی عدم موجودگی میں کانگرس کبھی کوئی زبردست کامیابی حاصل نہیں کرسکتی۔ دوسری طرف اگرچہ سرسید جمہوری نظام کو پسند کرتے تھے۔ لیکن وہ اس مغربی پارلیمانی نظام

کو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مہلک سمجھتے تھے۔ جس
میں ہر فیصلہ اکثریت کے رحم و کرم کا محتاج ہو۔ یہی وجہ
ہے کہ انہوں نے کانگریس کی مخالفت کی چنانچہ ۱۸۸۷ء میں
اپنی ایک تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا کہ اگر کونسل
کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد
ہندوؤں کے برابر نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ہندوؤں کی تعداد بمقابلہ
مسلمانوں کے چوگنی ہے۔ پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائے گا،
اس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا، تو چار ہندو ہوں گے۔
چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے اور
تعلیمی اور قومی فلاح پر اپنی تمام توجہ مرکوز کرنے کا
مشورہ دیا۔ اسی زمانے میں کانگریس کے بعض لیڈروں میں
جن میں تلک کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، کھلم کھلا
ایسے خیالات کا اظہار شروع کیا جس سے مسلمانوں کے جذبات
مجروح ہوتے رہے۔ آخر ۱۸۹۳ء کے قانون کے مطابق انتخاب
کا نیا طریقہ رائج ہوا۔ گو مسلمانوں کو حسب خواہ نمائندگی
نہ مل سکی کیونکہ ہندوؤں کے مقابلے میں ان کی حیثیت بہت
معمولی تھی۔ ملازمتوں میں ان کا حصہ پہلے ہی بہت کم تھا۔ چنانچہ
جب ہندوستان کے لئے نئی اصلاحات کا اعلان کیا گیا تو
مسلمانوں کا ایک وفد سرسید کے مشہور معتمد دوست اور نائب
نواب محسن الملک کی قیادت میں اکتوبر ۱۹۰۶ء میں لارڈ منٹو
سے ملا اور جداگانہ طریق انتخاب کا مطالبہ کیا۔ جو منظور کرلیا
گیا۔ اسی سال ۳۰ دسمبر کو ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ
کی بنیاد رکھی گئی تاکہ مسلمان اپنے سیاسی حقوق اور مفاد
کا تحفظ کرسکیں۔ چند برس تو مسلم لیگ کی پالیسی وہی رہی
جس پر کانگریس شروع شروع میں گامزن ہوئی تھی، لیکن جب
حکومت ہند نے تقسیم بنگال کے فیصلہ کو منسوخ کیا تو مسلمانوں
میں حکومت سے بے اطمینانی اور عدم اعتماد کی لہر دوڑ گئی
اور مولانا محمد علی نے جو آگے چل کر تحریک خلافت کے

رہنما بنے کھلے لفظوں میں حکومت کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کی۔

اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا یہ بڑا ہنگامہ خیز دور ہے برطانوی اقتدار کا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ علیگڑھ میں برطانیہ سے بعد کے آثار پیدا ہو رہے تھے اور عالم اسلام پر مصیبتوں کے جو پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اس نے ہندوستانی مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا کر دی تھی۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں انتہائی جوش و خروش اور اضطراب پیدا کر دیا تھا اسی زمانے میں مولانا شبلی اور علامہ اقبال نے بعض مشہور موثر نظمیں لکھیں اور مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ہمدرد کامریڈ اور الہلال کے ذریعے مسلمانوں میں ایک نیا ولولہ اور سرفروشی کا جذبہ پیدا کیا۔ ۱۸۵۷ء کے خونیں ہنگامے کے بعد اسلامی ہند سہما سہما نظر آتا تھا اور حالات کے تقاضے سے انہیں عارضی طور پر عملی سیاست سے الگ ہونا پڑا تھا۔ لیکن اب واقعات کا دھارا بدل چکا تھا اور غیر ملکی اقتدار کے خلاف شروع سے دلوں کے اندر جو نفرت موجود تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی ترک دوستی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اب تک دولت عثمانیہ کو اسلامی اتحاد کا مظہر سمجھا جاتا تھا۔ اور یہاں کے مسلمان یہ بھی سمجھتے تھے کہ اگر ترکی سلطنت بچ گئی تو یہاں کے مسلمانوں کے استحکام میں بڑی مدد ملے گی۔ اس زمانے میں دیوبند کے علما نے بھی سیاست میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ جنگ آزادی کے نو برس بعد ہی ۱۸۶۶ء میں دیوبند میں ایک ایسی درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی تھی جو شاہ ولی اللہ کی تحریک کا مرکز بن سکے۔ چنانچہ اس دور میں نہ صرف دیوبندی جماعت نے ترکوں کی مصیبت میں مدد کی بلکہ علی گڑھ اور دیوبند والے ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ پہلی جنگ عظیم سے کچھ عرصہ پہلے دونوں جماعتوں نے متحد محاذ بنا لیا تھا۔ جب جنگ شروع ہوئی تو عثمانی خلافت کو مدد

دینے کا فیصلہ کیا گیا اس پر مولانا محمد علی مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو نظر بند کردیا گیا۔ اور شیخ الہند کو حجاز میں اسیر کرکے مالٹا بھیج دیا گیا۔

اسی زمانے میں کانگرس اور مسلم لیگ نے متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں دونوں سیاسی جماعتوں کا سمجھوتہ ہوگیا جو 'میثاق لکھنؤ' کے نام سے مشہور ہے۔ اس سلسلہ میں قائداعظم محمد علی جناح نے، جنہیں آگے چل کر اسلامی ہند کی قیادت سنبھالنی تھی، نہایت نمایاں کردار ادا کیا اور انہیں 'ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار' کہا گیا۔

جنگ ختم ہوئی تو ترکی خلافت قریب قریب ختم ہوچکی تھی۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمان لیڈروں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طاقت نے اسلام کی بین الاقوامی قوت کو ختم کیا ہے اسے زک پہنچائی جائے۔ چنانچہ مولانا محمد علی اور ان کے ہم خیال لیڈروں نے کانگرس میں شرکت کی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی تو اسلامی ملکوں سے برطانوی شہنشاہیت کی گرفت کچھ نہ کچھ ضرور ڈھیلی ہوگی۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں کانگرس اور تحریک خلافت کے تعاون نے برطانوی استعمار سے زبردست ٹکر لی۔ مولانا محمد علی کے الفاظ میں، اس وقت ہم نے مسلمانوں کو کانگرس کی شرکت کے لئے آمادہ کیا اور ہندو اکثریت کے ساتھ مسلمان اقلیت کا اتحاد کرادیا اور انہیں اس پر راضی کیا کہ ۱۸۸۷ء میں جو سیاسی پالیسی مسلمانوں کی اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لئے سرسید احمد خان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ہندو اکثریت کی ذہنیت سے مجبور ہوکر اختیار کی تھی، اس کو بدل دیا جائے اور ہندو اور مسلمان اکثریت اور اقلیت دونوں ملکر انگریزی اقلیت کے استبداد کا خاتمہ کریں۔ اس جد و جہد میں مسلمان پیچھے نہیں رہے۔ خود مولانا محمد علی کے الفاظ ہیں ''حکام پرست بے شک ہمارے ساتھ نہ تھے لیکن حکام پرست ہندو بھی گاندھی جی کے ساتھ نہ تھے اور مسلمانوں

نے اپنی سیاسی اہلیت اور استعداد سے ثابت کردیا کہ ہندوستان
کی قومی سیاست میں ان کا حصہ ان کی آبادی کے تناسب سے
نہیں رہے گا۔ اور ان کی قربانیوں نے بھی ثابت کردیا
کہ قوم پروری میں وہ ہندوؤں سے کم نہیں، کچھ زیادہ ہی ہیں۔
لیکن اس عظیم الشان تحریک کو گاندھی جی نے چوری چورا کے
حادثے کے بعد جس میں چند ہندوستانیوں کی طرف سے تشدد
ہو گیا تھا، جس ڈرامائی انداز میں دفعتاً ختم کردیا اس کا کوئی
جواز نہیں ملتا۔ جبکہ اس وقت جب کہ کانگریس اور خلافت کی
عظیم تحریک نے غیر ملکی اقتدار کی بنیادیں ہلا رکھی تھیں،
گاندھی جی نے ایک آن میں اس کا خاتمہ کردیا۔ ظاہر ہے کہ
اس تحریک نے مسلمانوں کو سخت بددل کیا اور انتہائی
مایوسی کے عالم میں کانگریس سے الگ ہوتے گئے۔

اسکے بعد ہندو مسلم اختلافات بڑھتے گئے اور کئی مختلف مقامات
پر فسادات ہوئے۔ اس زمانے میں شدھی کی تحریک نے مسلمانوں کو
کانگریس سے برانگیختہ نہیں کیا بلکہ خود گاندھی جی کا مسلک
ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک طرف وہ کانگریس کے سیاسی
رہنما تھے تو دوسری طرف مذہبی رہنما بھی۔ انہوں نے ہندو
مذہب کے احیا کو اپنا مسلک بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک
طرف ان کا فلسفۂ زندگی کانگریس پر اثر انداز ہوتا چلا گیا تو
دوسری طرف غیر ہندو جماعتیں بالخصوص مسلمان کانگریس سے
متنفر ہوتے گئے، اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آل انڈیا کانگریس
کے سکریٹری نے یہاں تک کہہ دیا کہ کانگریس "گاندھی ازم"
کا دوسرا نام ہے، محض ایک سیاسی مسلک نہیں، بلکہ وہ ایک
لائحۂ زندگی ہے۔ جس کو کانگریس میں رہنا ہو وہ "گاندھی
ازم" کے اصول کو مانے، اور جو اس کے لئے تیار نہ ہو اس کی
جگہ کانگریس میں نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کی جگہ وہی
کانگریس میں نہ رہی۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ پر بحث کرنے کے
لئے کلکتہ میں جو اجتماع ہوا، اس میں قائد اعظم نے کانگریس

سے اتحاد کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور ایسی تجاویز
پیش کیں جنہیں تسلیم کرنے میں سر تیج بہادر سپرو جیسے اعتدال
پسند لیڈروں کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن کانگرس کی مہاسبھائی
ذہنیت رکھنے والی قوتوں نے صلح و اتحاد کی اس دیانتدارانہ
کوشش کو بھی ٹھکرادیا۔ جب تمام کوششیں رائگاں گئیں تو
۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ ہوا
جس میں علامہ اقبال نے اپنے تاریخی خطبۂ صدارت میں ملک
کی تقسیم کی تجویز پیش کی، جسے دس سال بعد مسلم لیگ نے
اپنا نصب العین قرار دیا اور جس نے مزید سات سال بعد پاکستان
کی شکل اختیار کی۔

علامہ اقبال کا یہ خیال کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی
علیحدہ ایک مملکت ہونی چاہئے ۱۸۵۷ء کے بعد کسی نہ کسی
شکل میں موجود رہا ہے۔ سرسید کی علی گڑھ کی تحریک کے پس
منظر میں یہ تصور موجود تھا۔ دیوبند، ندوۃ العلماء، جامعہ ملیہ،
کی تحریکیں اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں
کا ایک الگ تہذیبی وجود ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی
کے بعد اگرچہ یہ حقیقت مختلف رخ اختیار کرتی رہی، لیکن تمام
تحریکوں میں یہ قدر مشترکہ موجود رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ
علامہ اقبال نے پاکستان کا جو تصور پیش کیا وہ ایسی موہوم
شکل میں سرسید کے ان الفاظ میں بھی نظر آتا ہے جو انہوں نے
ہندی اردو جھگڑے کے سلسلہ میں کہے تھے۔ علامہ نے محض
اس ذہنی رجحان کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جو پہلے سے
ہندوستان کے مسلمانوں میں موجود چلا آرہا تھا۔ اور اس خوش
کن خواب کی تعبیر پاکستان کی صورت میں قائد اعظم محمد علی
جناح کی کوششوں سے قوم کو ملی۔

—*—

زبان

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اپنے اثرات اور عواقب کے اعتبار
سے بہت دور رس ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس سے پہلے ۱۸۵۶ء میں
سلطنت اودھ کی ضبطی نے بہت سے اسباب شورش کے لئے سامان
ضرور مہیا پہنچا دیا تھا۔ لیکن پھر بھی دلی کے لال قلعے میں
جھلملاتی ہوئی شمع سے بہت سے لوگوں کی امیدیں وابستہ تھیں۔
بہادر شاہ ظفر برائے نام بادشاہ تھے اور قلعہ معلیٰ کی چہار دیواری
میں بھی وہ اپنے قول و فعل میں آزاد نہ تھے، لیکن بہادر شاہ
اس کے باوجود سلطنت کی عظمت کی نشانی تھے اور تحریک آزادی
کے محرک کی حیثیت سے ان کی ذمہ داریاں بہت تھیں۔ سیاست کی
بساط پر سے ان کا اٹھ جانا صرف ایک کمزور مغل بادشاہ کا خاتمہ نہ تھا
اس کے ساتھ ایک تہذیب، ایک معاشرت اور ایک تمدن کا تصور
وابستہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی نے اس تہذیب
معاشرت اور تمدن کی بنیادوں پر ایک کاری ضرب لگائی اور اس کے
بعد انتقامی کارروائیوں نے لوگوں کے حوصلے پست کر دئیے۔
ہمارے وہ علما جو علم و فن کے علمبردار اور ہماری
تہذیب کے مظہر تھے جہاد کے فتووں پر دستخط کرنے کے
الزام میں پھانسی پر لٹکائے گئے اور شرفا کا وہ طبقہ جو ہماری
روایات کا وارث اور محافظ تھا تمام اس کے نام پر مغلوں کی

مدد کرنے کے الزام میں مٹا دیا گیا۔ غرض اس قیام امن میں
جو کچھ گذری وہ شاید ہولناک جنگوں میں بھی نہ گذری
ہوگی۔ یہاں سے ہماری سیاست، تعلیم، تہذیب و معاشرت، غرض
زندگی کے پودے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ان نئے اثرات
میں سے جن کا تعلق براہ راست ہماری زبان سے ہے اس وقت میں
ان کے بارہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مغربی قوموں اور ان کی زبانوں کے اردو پر اثرات کی تاریخ
اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور
انگریزوں نے تجار کی حیثیت سے اس سر زمین پر قدم رکھا اور
مغربی طور پر ان کے ساتھ آئی ہوئی بعض اشیا اپنے نام بھی اپنے
ساتھ لائیں۔ پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کا عرصہ وسعت اور مدت
کے اعتبار سے بہت کم تھا لیکن ان کے آثار بھی ہماری زبان
میں ملتے ہیں۔ لیکن انگریزوں نے تجارت اور پھر سیاست میں
اس طرح قدم جمائے کہ کم و بیش دوسو سال تک یہاں کے ملکی
معاملات میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا
کہ ان کی زبان اور معاشرت ان کے شعر و ادب نے اردو پر خاصا
اثر ڈالا۔ اس اثر کا باقاعدہ سلسلہ انیسویں صدی کے آغاز سے ہوتا
ہے، جب کلکتہ میں کمپنی کے نووارد ملازمین کو اس ملک کی
تہذیب و معاشرت، رسم و رواج، عقائد و تصورات اور یہاں کے
عوام کی گفتگو سے واقف کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور
فورٹ ولیم کالج اس ضرورت کی تکمیل کے لئے قائم ہوا۔ فورٹ ولیم
کالج کے ہندوستانی مصنفین مثلاً میرامن وغیرہ انگریزی زبان
یا ادب سے واقف نہ تھے۔ لیکن وہ گل کرائسٹ کی ہدایت اور
مشورے کے مطابق کام کرتے تھے۔ اور انہیں کے مشورہ سے میرامن
نے باغ و بہار ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں لکھی۔ یہ پہلا موقع
تھا کہ روز مرہ گفتگو کی عام زبان کو ایک اہم ادبی تحریر کے
لئے اختیار کیا گیا۔ اور اس طرح اردو میں پہلی سلیس اور آسان
اردو نثر کی کتاب معرض وجود میں آئی۔ میرامن کے علاوہ بھی

بعض مصنفین نے اعلیٰ درجے کی کتابیں لکھیں۔ لیکن جو قبول
عام اور شہرت دوام باغ و بہار کو نصیب ہوئی وہ کسی اور کتاب
کے حصہ میں نہیں آئی۔ اسی زمانے میں بعض انگریزوں نے اردو کی
لغت، صرف و نحو کی کتابیں اردو لسانیات اور اردو زبان کی تاریخ
پر بعض کتابیں لکھکر اردو کے علمی مطالعہ کا آغاز کیا۔
لیکن فورٹ ولیم کالج کا حلقہ اثر محدود اور اس ادارہ کے مصنفین
کا مقصد مخصوص تھا۔ اس لئے ان نئے رجحانات نے اس وقت کسی
تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔ البتہ ۱۸۵۷ء سے کوئی
پچیس تیس سال پہلے خود دلی میں ایک ایسا کالج قائم ہوا جہاں
پہلی مرتبہ جدید علوم و فنون کی تعلیم مشرقی زبانوں میں دینے
کا تجربہ کیا گیا۔ اور اس کے لئے انگریزی سے بعض درسی کتابوں
کا ترجمہ کیا گیا۔ ترجمہ کرنے کے لئے ایک باقاعدہ دارالترجمہ
تھا، جس نے نہایت واضح اصول اور ضوابط مرتب کئے۔ مختلف علوم
و فنون کی کتابوں کا ایک اہم حصہ آہستہ آہستہ اردو میں منتقل
ہونے لگا تھا۔ جس کے ساتھ زبان میں نئے الفاظ اور اصطلاحات
کا بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ کالج اور اس
کے دارالترجمہ کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گیا۔

۱۸۵۷ء کی فتح نے انگریزوں کے حوصلے بلند کردئے اور
انھوں نے نہایت بے دردی سے ملکی روایات اور قومی امنگوں کو
کچل ڈالنے کا سلسلہ شروع کیا۔ زبان کے سلسلے میں ان کا پہلا
وار یہ تھا کہ فارسی کی تہذیبی حیثیت کو ختم کردیا گیا۔
دفتروں، عدالتوں، تجارتی اور صنعتی اداروں میں فارسی کی جگہ
انگریزی نے لی۔ جو دفتری اور عدالتی کاروائی عوام کے انگریزی
سے نابلد ہونے کی وجہ سے مجبوراً اردو میں کی جاتی تھی، اس میں
بھی آہستہ آہستہ انگریزی الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے۔
پھر انگریزی اب حکمراں طبقے کی زبان تھی۔ اس لئے انگریزی
الفاظ کا استعمال مہذب ہونے کی نشانی سمجھا جانے لگا۔ اس طرح
انگریزی کے جو الفاظ اردو میں آئے وہ تین طرح کے تھے۔ پہلے

وہ الفاظ جو دفتری یا عدالتی زبان سے تعلق رکھتے تھے اور
جن کا استعمال خواص اور عوام دونوں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے
الفاظ ہیں جو آہستہ آہستہ اردو میں گھل مل کر اردو بن گئے۔
مثلاً جج، کلکٹر، ٹانسٹر (یعنی سرشتہ)، کورٹ فیس (یعنی کورٹ
فیس)، اسٹامپ (یعنی اسٹامپ)، ٹکٹ (ٹکٹ)، سمن (Summons)،
ڈگری، جنس، رپٹ (رپورٹ)، جرمن، کپتان (Captain)، کورٹ
صاحب (یعنی Court Inspector)، ہائی کورٹ (یعنی عدالت عالیہ)،
اپیل (Appeal)، رنگروٹ (Recruit)، اردلی (Orderly) وغیرہ۔
سینکڑوں الفاظ آج ایسے ہیں جن کے ترجمے کی ضرورت نہیں، اور جن
کی اجنبیت آج ختم ہوچکی ہے۔

دوسری قسم کے الفاظ وہ ہیں جو شہری عام تہذیبی
اور سماجی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر ان چیزوں
کے نام ہیں جو انگریزوں کے ذریعے سے ہم تک پہنچیں۔
مثلاً پھلوں میں سنترہ (Cintra)، مالٹا (Malta)، موسمی
(Mosambique)۔ سبزیوں میں ٹماٹر وغیرہ۔ بسکٹ، توس،
اراروٹ، ڈبل روٹی، وغیرہ۔ لباس میں کوٹ، ڈبل سوٹ، ٹائی،
بٹن وغیرہ۔ غرض اس ضمن میں بھی بے شمار الفاظ ہیں جو خاص
و عام کی زبان پر رواں ہوگئے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کا استعمال
۱۸۵۷ء کے بعد کی تصنیف میں بھی ملتا ہے۔ الفاظ کا تیسرا
اور نہایت اہم ذخیرہ ادبی، علمی اور فنی الفاظ کا ہے جن کا سلسلہ
تو دلی کالج سے شروع ہوتا ہے لیکن جن میں ۱۸۵۷ء کے بعد
ہی خصوصیت کے ساتھ اضافہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے
پہلے سرسید احمد خاں کی تحریک کا ذکر کرنا چاہئے۔ ۱۸۵۷ء
کے ہنگامہ کے بعد یہ سب سے پہلی تعمیری تحریک تھی جو اس
برعظیم میں شروع ہوئی۔ بعض لوگ سرسید کو انگریزوں کا آلۂ کار
سمجھتے ہیں، لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ سرسید کے پیش نظر
مسلمانوں کی بالخصوص اور اہل ہند کی بالعموم اصلاح تھی اور
ان کا یہ خلوص ان کی تمام تحریروں میں جھلکتا ہے۔ یہ درست

ہے کہ وہ انگریز اور انگریزی کے ساتھ تعاون کے علمبردار ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ انگریزوں اور مسلمانوں میں جو رخنہ پڑگیا تھا اور جس کی وجہ سے مسلمان خصوصیت کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ستمرسیدہ گردانیوں کا شکار ہورہے تھے اس کے روکنے کی صرف ایک ہی صورت تھی۔ دونوں کو قریب تر لانے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ انگریزوں اور انگریزی کے خیالات اور تصورات کو اردو میں منتقل کیا جائے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک اخبار اور ایک رسالہ نکالا یہ اخبار ان کی قائم کردہ "سائنٹیفک سوسائٹی" کا ترجمان تھا اور دو کالم کے حصے میں چھپتا تھا۔ اس کا ایک حصہ انگریزی میں اور دوسرا اردو میں ہوتا تھا۔ معلوماتی مضامین علمی تحریریں، سیر و سیاحت کے حالات غیر ملکوں کی خبریں ایجادات اور انکشافات کی اطلاعات عام طور پر اس اخبار میں شائع ہوتی تھیں۔ لیکن اخبار سے زیادہ مشہور اور اہم ان کا رسالہ "تہذیب الاخلاق" تھا جو انگریزی جرنل اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر کے انداز پر نکالا گیا تھا۔ اس میں ایڈیسن اور اسٹیل کے لکھے ہوئے مضامین کا ترجمہ ہوتا تھا۔ سرسید اور ان کے دوسرے مضمون نگار بھی اسی قسم کے مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی زبان پر قدرتی طور پر بہت سے انگریزی الفاظ آجاتے تھے، مثلاً سرسید کے صرف ۹ منتخب مضامین میں یہ الفاظ موجود ہیں: —

یونیورسٹی، ڈگری، بی اے، ایم اے، ماسٹر، سوسائٹی،
کالج، لکچر، اسپیچ، سر، مسٹر، پروفیسر، سائینس،
ٹیکنیکل ایجوکیشن، گورنمنٹ، ڈاکٹر، ڈاکٹری،
انجنیر، سائینس، آرٹیکل، پارلی منٹ، آنریبل ممبر،
ہاؤس آف کامنز، نیچر، رومن کیتھولک، پروٹسٹنٹ،
سول لا، نیچرلسٹ، بگ، سولیوشن، ٹیسٹ (Taste)،
گورنر جنرل، کونسل، ووٹ، آئرلینڈ، سنٹرلائزڈ،
سولائزڈ، انسولائزڈ، سلف، آنر، اگریسو۔

سرسید کے دوسرے مضامین اور مقالات کا جائزہ لیا جائے

مولوی نذیر احمد آتے ہیں۔ غرض ان لوگوں کی بدولت انگریزی
کے بے شمار الفاظ علمی اور ادبی اردو زبان میں داخل اور رواں
ہوگئے۔ لیکن یہ تمام الفاظ صرف اجنبی لغت کی حیثیت سے اردو
میں شامل نہیں ہوئے بلکہ اپنے ساتھ نئے تصورات نظریات اور نئی
تشریحات لے کر آئے۔ ان کے پردے میں ایک نئی تہذیب ایک
مختلف معاشرت ایک نئے ادب اور انشاء کی جھلک بھی موجود
تھی۔ سرسید اور حالی دونوں کے یہاں ایسے الفاظ کی کثرت ہے
جن کا تعلق زیادہ تر ان کے سوشل امور سے ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا
کہ سماج کے مغربی تصورات اور نظریات ان کی تحریروں کے
خاص موضوعات ہیں۔ مغربی مصنفین، مفکرین، شعرا ادیبوں سیاسی
کارکنوں صحافیوں اخبار نویسوں اور مصنفوں کے نام جو ابھی آپ نے
اس فہرست میں دیکھے، نئے خیالات اور تصورات کا سرچشمہ ہیں
اور یہ تمام خیالات جن کا تعلق اصلاح معاشرت اصلاح زبان اور
اصلاح ادب سے ہے، اردو میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کی
بدولت ہی رائج ہوئے۔

ظاہر ہے مغرب سے مضامین اور خیالات ترجمہ کرنے میں
ارادی اور غیر ارادی طور پر یہ تمام مصنفین بعض نئی اصناف
اور شعری و ادبی سانچوں سے آشنا اور متاثر ہوئے مثلاً ''ایسے،، اور
''آرٹیکل،، جیسے مغربی رسالوں اور اخباروں میں ہوتے تھے۔ ان کا
ایک خاص انداز تھا، جو اردو کے مضامین سے مختلف تھا۔ ان نئی
اصناف کے لئے ظاہر ہے اردو کا کوئی موزوں لفظ اس وقت تلاش
کرنا مشکل تھا۔ اگرچہ آج بھی ہم صحافت میں اڈیٹر، کالم،
نوٹ، کارٹون اور بہت سے انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں،
لیکن اب بعض پرانے اردو الفاظ بھی ان مطالب کے لئے ادا ہونے
لگے ہیں۔ مثلاً ''ایسے،، کے لئے مضمون یا مقالہ، ایڈیٹر کے لئے
مدیر، لیڈنگ آرٹیکل کے لئے شذرہ افتتاحیہ وغیرہ۔

مغربی مصنفین کے ناموں اور ان کے کاموں کے ساتھ ساتھ
اس دور میں اردو مغربی زبانوں خاص طور پر انگریزی کے طرز ادا

کتابوں کے ترجمے ہوں گے۔ دفتری اور عدالتی زبان میں نئی اصطلاحیں بنائی جائیں گی۔ جدید علوم و فنون کی زبان جو آج دنیا کے مختلف علاقوں میں لکھی جارہی ہیں انگریزی کے ذریعے سے ہم تک پہنچینگی اور پھر ان کے مضامین اور خیالات کا ترجمہ ہوگا اور اس طرح ہماری زبان اپنی ترقی کے امکانات کو حقائق میں بدل سکیگی۔

-*-

ادب

سید عابد علی عابد

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ جسے انگریز مورخ غدر کہہ کر پکارتے
ہیں کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس دن سے انگریزوں
نے ہندوستان پر قدم جمائے تھے اسی دن سے تحریک آزادی
کی چنگاریاں بھی سلگنے لگی تھیں۔ مسلمانوں کے دل سے صحیح
اغیار کی حکومت کے برخلاف جذبے کا رخ ہو گیا تھا۔ چنانچہ
انگریزوں نے ٹیپو کی شکست کے جشن پر اسی بہانے تسلط
استوار کی تھی۔ مگر جب ۱۸۵۷ء زندگی پر گہرے اور دور رس اثرات
پیدا کرکے رفع ہوگیا جن دنوں تحریک آزادی عروج پر تھی،
انہی دنوں انگریز مدبروں نے یہ کہنا شروع کردیا تھا کہ جب
تک مسلمانوں کے رشتے سے اقتدار کو منقطع نہیں کردیا
جائے گا انگریزی حکومت کی بنیادیں استوار نہیں ہوں گی۔

تحریک آزادی کے فرو ہونے کے بعد انگریزوں کی نئی
حکمت عملی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ مسلمان امیروں اور
جاگیرداروں کی زمینیں ختم کردی گئیں۔ مسلمانوں کو چن چن
کر تہ تیغ کیا گیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی
آخری علامت یعنی بہادر شاہ ظفر کو رنگون بھیج دیا گیا، اور
صحیح معنی میں برعظیم ہند و پاکستان میں فرنگی عملداری
قائم ہوگئی۔ مسلمانوں کے لئے یہ بڑا نازک مقام تھا۔ ایک تو یہ

کہ وہ سیاسی طور پر کچلے جا رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ اقتصادی
طور پر بھی ان کو بے حال بنانے کی کوششیں جاری تھیں۔
اسوقت سرسید احمد خاں نے ہندوستانی مسلمانوں کی ایسے اسلوب
سے رہنمائی کی کہ باید و شاید۔ سرسید نے بجا طور پر محسوس کرتے
تھے کہ اغیار اس موقع پر ہر اس تحریک کو سختی سے کچل دیں
گے جس میں کسی سیاسی عنصر کی آمیزش ہو یا جو مسلمانوں
کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس
لئے سرسید احمد خاںؒ نے مسلمانوں کے بچے کھچے ذوق عمل کا رخ
موڑ کر ایک نئی تحریک کی بنیاد ڈالی جس سے حیرت انگیز اثرات
رونما ہونے والے تھے۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ اغیار
ہی کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر حملہ کیا جائے اور اس حملے
کی رفتار ایسی ہو کہ جب تک کاری اور مہلک ضرب لگانے
کا موقعہ نہ آئے اس وقت تک اغیار خطرے کی نوعیت سے بالکل بے
خبر نہ ہونے پائیں۔

سرسید احمد خاں نے اس حملے کے مندرجہ ذیل مقاصد قرار دئے:

(۱) مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور انگریزی علوم و فنون
سے بہرہ ور کیا جائے تاکہ وہ مغرب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو
کامیابی سے روک سکیں۔

(۲) مسلمانوں کے دل میں اپنی تہذیبی اور ملی عظمت
کا احساس پیدا کیا جائے تاکہ وہ اپنی کھوئی ہوئی جرأت
کو دوبارہ حاصل کرنے میں کوشاں ہوں۔

(۳) تعلیم کے ذریعے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو آہستہ
آہستہ ایسی ارتقائی شکل دی جائے کہ وہ اغیار کی حکومت
کا جوا آہستہ آہستہ اپنے کندھوں سے اتار پھینکیں۔

سرسید احمد خاں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے
صحافت کا وسیلہ ڈھونڈا اور رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے اردگرد
ایسے لوگوں کو جمع کرلیا جو ہر طرح ان کے محرم راز تھے۔
انہیں لوگوں نے مختلف ادب کے ذریعے آہستہ آہستہ وہ چنگاریاں

سلاخوں جن کو شعلے بنکر برعظیم ہند پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لینا ہے۔ سرسید احمد خان کا منصوبہ کتنا منظم تھا، اسکا اندازہ صرف اسی سے ہوسکتا ہے کہ آزادی کی جد و جہد کے اب تک جتنے چشمے پھوٹے ہیں ان کا ماخذ و منبع انہی لوگوں کی تحریریں تھیں جو سرسید کے رفقائے کار تھے۔ ذرا غور کیجئے گا۔ مذہب کے معاملے میں تنگ نظری رفع کرنے کے لئے خود سرسید نے قرآن مجید کی ایک نئی تفسیر لکھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے مخالفتیں بھی برداشت کیں۔ ان کے خلاف کفر کے فتوے بھی صادر ہوئے، لیکن وہ برابر اپنے کام میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ اکبر الہ آبادی کو بھی جو ان کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھے کہنا پڑا:

دل ترا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا
سید اٹھے جو گزٹ لیکے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

سرسید کے رفقا میں جس شخص نے سب سے زیادہ بے لوثی سے مسلمانوں کی خدمت کی اور سرسید کی تحریک کو پروان چڑھانے میں اعانت کی اسے تاریخ حالی کہہ کر یاد کرتی ہے۔ حالی کی نثری اور شعری تخلیقات کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا کہ وہ قوم کو ایک نئے حملے کے لئے تیار کر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس حملے سے مراد یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی چنگاریوں کو پھر سلگایا جائے تاکہ آخرکار مسلمان اغیار کی حکومت سے نجات حاصل کرکے اپنی تمدنی اور سیاسی میراث کو دوبارہ حاصل کرسکیں۔ مسدس میں اس مقصد کے حاصل کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کا اسلوب، انداز بیان، زاویہ نظر، مطالب و معانی، ترتیب، سب اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اگرچہ حالی انگریزی حکومت کی برکتوں کے گن بھی گاتے تھے اور یہی مصلحت تھی۔ لیکن ساتھ ساتھ مسلمانوں کو یہ تلقین بھی کرتے تھے کہ ان

برکتوں سے ٹھیک طریقے پر بہرہ یاب بھی ہوں۔ جمہوریت کے اصولوں کے مطابق سیاسی شعور کو بیدار کرنے کی غالباً اردو میں یہ پہلی منظم کوشش تھی اور اس میں حالی کا طریقہ پیچدار تھا۔ رفتہ رفتہ حالی نے اقبال کی ہنگامہ آرائی کے لئے فضا ہموار کی۔ حالی کی بعض سیاسی نظمیں اور جدید غزلوں کے بعض اشعار بہت معنی خیز ہیں مثلاً:

صلح ہے یا مہلت سامان جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو خالی یاں تفنگ

لک و قمری میں یہ جھگڑا ہے چمن کسکا ہے
کل خزاں آکے بتادے گی وطن کس کا ہے

ڈاکٹری معائنے کے سلسلے میں کالے اور گورے کے فرق پر جو انہوں نے مختصر سی نظم لکھی ہے، بہت معنی خیز ہے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اقبال نے مغرب کی تہذیب کو مغربی افکار سے مسلح ہوکر جس طرح غارت کرنے کی کوشش کی ہے، حقیقت میں وہ حالی ہی کا فیضان ہے۔ حالی کے شریک کار ادیبوں میں شمس العلما مولانا حافظ نذیر احمد بھی تھے۔ جو ڈپٹی نذیر احمد کے نام سے زیادہ مشہور تھے۔ جنگ آزادی کی ناکام تحریک کے بعد جب سرسید احمد نے مسلمانوں کے تمدنی اور تعلیمی احیا کا بیڑا اٹھایا تو نذیر احمد نے غالباً سب سے زیادہ ان کا ہاتھ بٹایا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ کوئی قوم صحیح معنی میں اس وقت تک تمدنی اور سیاسی سوجھ بوجھ کی حامل نہیں ہوسکتی جب تک اس قوم کی عورتیں تعلیم یافتہ اور مہذب نہ ہوں۔ نذیر احمد نے اپنے افسانوں، ناولوں اور تحریروں کے ذریعے عورتوں کو یہ ترغیب دلائی کہ وہ تعلیم و تربیت سے بہرہ یاب ہوں۔ اور ان نونہالوں کو اپنی آغوش شفقت میں پروان چڑھائیں، جنہیں ایک نئی جنگ آزادی میں حصہ لینا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کو عورتوں کی تربیت کا کتنا خیال تھا اسکا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 'توبة النصوح' میں انہوں نے عورتوں کی کردار کشی

میں نہ صرف احتیاط اور چابک دستی سے کام لیا ہے بلکہ ان کو مردوں کی اصلاح پر مقرر کیا۔ غالباً ان کی کتاب ''امہات الامہ،، بھی عورتوں میں اپنے صحیح مقام کا شعور پیدا کرنے کی جو کوششیں انہوں نے کی تھیں، اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے استحکام کی جو منظم کوشش کی گئی تھی اس کو ناکام بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو اسی گمشدہ عظمت یاد دلائی جائے تاکہ انہیں احساس ہو کہ وہ کن کن انقلابات سے گذر کر کن حالات تک پہنچے۔ اسی بات کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے دل میں یہ یقین پیدا کیا جائے کہ ان کے علمی اور فنی ادارے اپنے زمانے کے اعتبار سے مغرب کے اداروں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی معلومات حاصل ہونے سے ہمارے دل میں بجا طور پر یہ خیال آتا ہے کہ ہم تہذیب مغرب کے محتاج نہیں ہیں اور ہم نے بھی مملکت داری اور جہانبانی کے اصولوں کو سمجھا اور برتا ہے۔ سرسید کی نگرانی میں یہ کام شبلی نعمانی نے انجام دیا ان کی تصنیف ''المامون،، ''الفاروق،، اور ان کے مختلف مضامین جو ''رسائل شبلی،، کے عنوان سے شائع ہوچکے ہیں، سب کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو اپنی تمدنی میراث کی ہمہ گیری سے آگاہ کیا جائے سچ پوچھئے تو ان کی کتاب ''سیرت النبی،، بھی جنگ آزادی ہی کی تحریک کا رد عمل تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی عملداری قائم ہوجانے سے جو دور رس نتائج پیدا ہوئے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ لوگ مذہب سے بیگانہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور اس بیگانگی کے پیدا کرنے میں ان مورخوں اور پادریوں کی تحریروں کا بہت حصہ تھا جو رسول اقدس کی زندگی کے واقعات کو مسخ کرکے پیش کرتے تھے۔ ''سیرت النبی،، ان تمام اعتراضات کا مدلل جواب دینے کی کوشش ہے جو غیروں نے اسلام کے پیمبر اور اسلامی نظام حیات پر کئے تھے۔

سرسید کے دور ہی میں اکبر نے اپنا جہاد اکبر شروع کردیا تھا۔ اس کا کلام گویا حالی اور اقبال کے کلام کے درمیان نہایت اہم درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے اکبر کو سرسید سے اختلاف تھا۔ یہ اختلاف حصول مقصد سے نہ تھا، طریق کار میں تھا اور کچھ یہ بھی تھا کہ اکبر نے سرسید کی تحریک کی غائت سمجھنے میں مجتہدانہ غلطی کی۔ بہرحال مسلمانوں کے سیاسی اور تمدنی شعور کے احیاء میں اکبر کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان کی بغاوت مغربی تہذیب، تمدن، تعلیم اور یہاں تک کہ سائینس کے خلاف بھی تھی۔ یوں ان کے کلام میں افراط کی ناھمواری پائی جاتی ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے مغرب کے قائم کردہ تہذیبی، تربیتی اور علمی اداروں کے نقائص کو کھول کھول کے بیان کیا اور یوں ہمارے دل میں احساس پیدا کیا کہ جس چیز پر ہم دیوانہ وار مر مٹے ہیں وہ اتنی والہانہ سفتگی کی سزاوار نہیں۔ ان کی نظم ''دھلی دربار،، بہت معنی خیز سیاسی اشاروں پر مشتمل ہے۔ یہ بند سنئے گا:

اوج بخت ملاقی ان کا — چرخ ہفت طاق ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا — آنکھیں میری باقی ان کا

''برق کلیسا،، میں انہوں نے جس لطف اور خوبی سے اس قیمت کا ذکر کیا ہے جو مسلمانوں کو حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے میں ادا کرنی پڑی، اسکی نظیر اردو ادب میں ملنی مشکل ہے۔ ''برق کلیسا،، تہذیب فرنگ ہے کہ مسلمان سے ذوق عمل، سیاسی شعور، جہاد کی تمنا، ایمان کا احساس، چھین لینا چاہتی ہے اور اس کے بدلے کچھ دولت دنیوی اور کچھ اعزاز منصبی عطا کرتی ہے۔ ''برق کلیسا،، کہتی ہے۔

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بنکر

[illegible] کی [illegible] [illegible] ہے جس
گرے آسماں سے پرانے ستارے

ضمیر جہاں اسقدر آتشیں ہے
کہ دریا کی موجوں سے ٹوٹے ستارے

زمیں کو فراغت نہیں زلزلوں سے
نمایاں ہیں فطرت کے باریک اشارے

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے "ولر" کے کنارے

— —

وہ جو حکم پائیں گی دل و جان سے بجا لائیںگی۔ صحیح خبر دی گئی ہے کہ یہ حکم جو امیر دوست محمد خان کے خلاف ہے دراصل شاہ ایران کی ایک چال ہے۔ اپنے اصلی مقاصد کو پوشیدہ رکھنے کے لئے۔ ان کا مقصد امیر سے لڑنے کا نہیں ہے، بلکہ انگریزوں سے لڑنے اور ان پر فتح پانے کا ہے۔ میر مرتضوی طاقت پر بھروسہ کرکے انگریزوں سے مل گئے ہیں اور انگریزوں اور ایرانیوں کے درمیان تمام بے لطفیوں کے موجب ہیں۔ شاہ ایران نے ہر دست دوستانہ تعلقات انگریزوں سے ظاہراً منقطع نہیں کئے ہیں نہ انہوں نے امیر دوست محمد خان سے دائمی دشمنی اختیار کی ہے۔ تاہم یہ صحیح ہے کہ تینوں طاقتوں میں کچھ نہ کچھ خیالات کی تبدیلی ضرور ہوگئی ہے۔

اقتباس از 'صادق الاخبار' دھلی:

(نمبر ۲، جلد ۳۔ مورخہ ۲۳۔ مارچ ۱۸۵۷ء)

بادشاہ ایران کے نام سے اعلان: سابق میں چند مفسدین نے دھلی میں ھنگامہ برپا کرنے کے لئے یہ سمجھ کر کہ شہرت ہوگی جامع مسجد کی سنت پر ایک اعلان شاہ ایران کی طرف منسوب کرکے سب کو مغالطہ میں ڈالنے کے لئے چسپاں کردیا تھا۔ اس اعلان کا لب لباب یہ تھا کہ ھندو مسلمان دونوں عیسائیوں کی مدد نہ کریں اور شاہ ایران عنقریب ھندوستان فتح کرلے گا۔ اور لوگوں کو نعمہ و اکرام دیکر خوش کرے گا۔ جس شخص نے یہ اعلان مشہور کیا ہے اس کا نام محمد صادق بتایا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اس لغو و لایعنی بات سے حکام دھلی بہت خفا ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جو شخص اس جعل سازکاذب کو گرفتار کرادیگا خاطر خواہ انعام پائے گا۔ لیکن خدا معلوم وہ اب ہاتھ بھی آئے گا یا نہیں۔ ھمارے اچھے کرم فرما مسٹر محمد صادق خان جعل ساز جنہوں نے یہ اعلان کیا ہے ھمیں یقین ہے کہ اگر گورنمنٹ کے ہاتھ لگ گئے تو ایک دو تلے کا جوتا سرکہ میں

ڈر کیا ہوا ان کی ٹانٹ پر پڑیگا۔ جس سے ان کے بال نہایت خوشنمائی سے جھڑ جائیں گے۔ اس وقت یہ حضرات سمجھ جائیں گے کہ شیشے کے گھر میں رہکر دوسروں پر پتھر پھینکنا کیا نتیجہ دکھاتا ہے اور ان بیوقوفوں کی لیاقت کس طرح ناک کی راہ سے نکل پڑتی ہے''۔

یہ اقتباس دہلی کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول اخبار ''صادق الاخبار'' کا ہے۔ شاہ ایران کے اسی اعلان کے متعلق دہلی کے دوسرے مشہور اخبار ''خلاصۃ الاخبار'' کی رائے و قیاس بھی ملاحظہ فرمائیے:

اقتباس از 'خلاصۃ الاخبار' دہلی:

(نمبر ٨ جلد ١ - مورخہ ١٣ - اپریل ١٨٥٧ء)

ایران۔ چند روز ہوئے کہ جامع مسجد کی دیوار پر ایک اعلان چسپاں کیا گیا تھا۔ اس پر ایک تلوار اور ڈھال کی شکل بنی ہوئی تھی۔ اور یہ اعلان شاہ ایران کے پاس سے آیا ہوا بتاتے تھے۔ اس کا خلاصہ یہ تھا: ''تمام سچے مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ کمر بستہ ہوکر شاہ ایران کی اعانت کریں اور وفاداری سے اس کی حکومت و اختیار کو محفوظ رکھیں اور انگریزوں سے جہاد کریں تا کہ انہیں تباہ و برباد کرکے اس کی عنایت کے مورد ہوں اور انعامات و خطابات حاصل کریں جو شاہ ایران فراخ دلی سے عطا کرے گا''۔ پھر اعلان میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ شاہ ایران با حشمت شاہی بہت جلد ہندوستان آئے گا اور اس ملک کو خود مختار بنادے گا اور ایران میں عوام الناس جمع ہوکر حسب ذیل فقرہ بار بار تکرار کرتے ہیں: ''خدایا خاک ایران کو بد بختوں کی ہوا سے بچائیو۔ جب تک کہ خاک و ہوا باقی رہیں''۔

مجسٹریٹ کی عدالت میں بےشمار گمنام درخواستیں وصول ہوئی ہیں اور ان میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آج کی تاریخ سے ایک

سے بعد کشمیر پر حملہ کیا جائے گا، جس کی فرحت افزائی اور خوبصورتی کا ایک شاعر نے یوں خاکہ کھینچا ہے: ''اگر ایک مرغ بصورت کباب کشمیر میں لایا جائے تو کشمیر کی ہوا سے اس کے بھی بال و پر پیدا ہوجائیں گے۔''

محرر اخبار ان تمام باتوں کو مزخرفات اور حمق پر مبنی سمجھتا ہے کیونکہ اگر ممالک حکومتوں کے ہاتھ سے یوں ہی نکل جایا کریں تو فوجوں کا کیا فائدہ؟

شاہ ایران کے اعلان تسخیر ہند کو اس زمانے کی سیاسی فضا میں بے حد اہمیت حاصل تھی۔ مورخہ ۱۰ -مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے جنگ آزادی کی ابتداء ہوچکی تھی۔ فوجیں دہلی آگئی تھیں۔ تمام شہر میں آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد اور کشمکش جاری تھی۔ چنانچہ ۱۱ -مئی ۱۸۵۷ء کے ''صادق الاخبار'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو عین جنگ آزادی میں شائع ہو تھا:

اقتباس از 'صادق الاخبار' دھلی:

(نمبر ۱۹ جلد نمبر ۳ مورخہ ۱۱- مئی ۱۸۵۷ء)

شاہ ایران کا اعلان تسخیر ھند

انگریزی اخبار ''پنجابی'' کا یک ایڈیٹر اپنی نمبر ۱۱ کی اشاعت میں رقم طراز ہے کہ محمرہ پر قبضہ کرتے وقت اس کے نامہ نگار کو شہزادے کے خیمے سے ایک اعلان دستیاب ہوا جس کا خلاصہ نامہ نگار مذکور نے بذریعہ تار برقی ایڈیٹر کو روانہ کیا ہے اور جسے اب ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اعلان کا خلاصہ یہ ہے:

معلوم کرنا چاہئے کہ انگریزی حکومت نے اپنی فتح مندی کا علم سب سے پہلے ہندوستان میں نصب کیا ہے اور پھر آہستہ آہستہ تمام مقبوضات مشرق کے مشہور سلاطین کو اپنے قابو میں

لا رہی ہے۔ تھوڑا عرصہ گذرا کہ اس نے افغانستان پر قبضہ کر
لیا تھا لیکن افغانوں کی مسلسل ہنگامہ آرائیوں سے تنگ آکر اسے
چھوڑنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے لاہور و پشاور اور دیگر خود مختار
ممالک لے لئے۔ اب وہ پھر افغانستان مع ایران کو بھی زیر و زبر کرنا
چاہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ حکومت ہمارے ہم مذہب
ہمسایہ افغانوں سے دوستی کررہی ہے تاکہ یہ اسے گذر جانے
دے اور وہ آکر ایران کو تہ و بالا کر ڈالے اور مذہب حق کے
پیروؤں میں نا اتفاقی ڈالدے۔ مزید برآں یہ سنا گیا ہے کہ ایران
پر فوج کشی کی غرض سے ایک انگریزی فوج براہ خشکی روانہ
ہوگئی ہے اور اس نے ایک بحری قلعہ، جو راہ میں پڑتا ہے، اور وہ
مسلمانوں کا ہے، لے بھی لیا ہے اور وہیں مقیم ہے۔ لیکن گورنمنٹ
اسے پیش دستی نہیں کرنے دیتی، اور جانتی ہے کہ اگر وہ
ایسا کرے گی تو مسلمانوں کے غصے اور سر دھڑ کی تلوار سے
کام پڑیگا اور بہت جلد جانکنی کی حالت میں، جیسے مچھلی پانی میں
سے باہر، تڑپتی ہوگی اور دم توڑتی پھرے گی۔ لہذا شاہ
ناصر الدین بادشاہ ایران، نہایت وثوق سے یہ اعلان کرتے ہیں:

اعلان: تمام فوجوں کو حدود ایران کے مختلف مقامات پر جمع
ہو کر ان دشمن دین کی مزاحمت کرنی چاہئے جو مخالف
اسلام ہیں۔ اقوام عرب کو لازم ہے کہ ہمسر کی قسم جنہوں
نے تمہیں صدمہ پہنچایا ہے تم بھی انہیں صدمہ پہنچاؤ،
پر عمل کریں۔ پس واجب ہے کہ بوڑھے، جوان، ادنیٰ، اعلیٰ
عقلمند، کم فہم، کسان اور سپاہی، سب کے سب، بے پس و پیش
اپنے ہم مذہبوں کی حمایت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، شہر پناہ
باندھ لیں۔ علم اسلامی بلند کریں، اور اپنے ہم قوموں کو بھی
راہ خدا میں جہاد کرنے کی دعوت بھیجیں، چنانچہ ان کو جو
حامی دین ہوں گے ان کی جانفشانیوں کا اجر خدا عطا کرے گا
اور ما بدولت بھی خوش ہوں گے۔ ....
وغیرہ وغیرہ۔

سے بخوبی خاطر اپنے حدود سے بے گزرنے دیا ہے۔ لیکن بموجب
مشہور شدی کہاوت کے کہ برہمن کھانے کی دعوت پر اس
وقت یقین کرتا ہے جب کھانا سامنے آتا ہے، اہل ہندوستان بھی
اسی وقت یقین کرسکے جب کوئی عینی شہادت مل جائے گی۔
لیکن کئی وجوہات کی بنا پر ہم یہ کبھی نظر نہیں رہ سکتے کہ
خواہ موجودہ خبریں صحیح ہوں یا محض لیکن ہمیں یہ دیکھنا
چاہئے کہ ایک نہ ایک روز ایرانی فوجیں ضرور آسکتی خواہ
درہ بولان سے ہوکر آئیں یا ہمیشہ یا سندھ سے۔ باقی خدا ہی
علام الغیوب ہے یعنی غیب کی خبریں سوائے اس کے کسی کو
معلوم نہیں"

دہلی کے مشہور اخبارات 'صادق الاخبار'، 'خلاصۃ الاخبار'، اور 'اردو اخبار' کے یہ چند اقتباسات جنگ آزادی کے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ ان سے اس زمانہ کی خبروں، وسائل اور اخبار نویسی کے متعلق بھی کافی معلومات حاصل ہوجاتی ہیں۔

—*—

تیار نہیں تھے۔ اس بنا پر ملاقات نہ ہوسکی۔

کے پرچم کا حرف ثابت ہو۔

ان کے ولولے اور ان کا جوش عمل اور ان کی ناکامیاں اور محرومیاں
ایک مرقع بنکر سامنے آجاتی ہیں۔

بہادر شاہ ظفر پر سلطنت مغلیہ کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن کیا ظفر
چاہتے تو وہ اس انقلاب کو روک سکتے تھے؟ کیا ان میں
اس قدر صلاحیت اور قوت تھی جو وہ اس طاقتور تحریک کو جس کی
بنیادیں پوری ایک صدی سے گہری جمی آرہی تھیں، گرنے سے
روک لیتے اور کیا وہ تنہا اس جنگ آزادی میں، جسے برطانوی
عہد کے مؤرخین ''غدر،، کے مکروہ نام سے یاد کرتے ہیں، ایک
سامراجی قوت کا کامیابی سے مقابلہ کرسکتے تھے؟ یہ اور اس
قسم کے دوسرے سوال ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن
ان کا جواب بہادر شاہ ظفر کا مؤرخ ہی دے سکتا ہے۔ ہم صرف
یہ دیکھیں گے کہ اس جنگ آزادی کی کہانی ان کے فرامین
میں کہاں کہاں اور کس طرح ظاہر ہوتی ہے۔

بہادر شاہ کے مطبوعہ فرامین میں ان کے وہ احکام شامل
ہیں جو جنگ آزادی کے سلسلہ میں انہوں نے بعض درخواستوں
اور مراسلوں پر تحریر کئے تھے۔ اور جن کو بہادر شاہ پر مقدمہ
چلاتے وقت بطور شہادت ان کے خلاف پیش کیا
گیا تھا۔ یہ کاغذات Trial of Bahadur Shah میں شامل
تھے۔ بعد میں خواجہ حسن نظامی صاحب نے ''غدر کے فرمان،، کے
نام سے انکا ترجمہ کردیا۔ یہ خطوط بیشتر اردو میں تھے۔
Trial of Bahadur Shah میں ان کا انگریزی ترجمہ کیا گیا
ہے اور پھر انگریزی سے اردو میں منتقل ہوئے۔ اس طرح ان فرامین
کی عبارت اصل بہادر شاہ کی عبارت نہیں ہے اور یہ بھی ممکن
ہے کہ ان میں تصرف کیا گیا ہو۔ بہرحال ان فرامین کے مطالعہ
سے کئی باتیں واضح ہوجاتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ بہادر شاہ
جنگ آزادی کی تحریک کا مرکز اور محور تھے۔ لیکن یہ ایک
عوامی تحریک تھی اور اختلاف مذہب یا اختلاف زبان ان لوگوں
کے اتحاد میں مانع نہ تھا جو اس جنگ میں شریک تھے۔ دوسری طرف

جو نخل پر ثمر ہیں اٹھاسکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

باد صبا اڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک
ملتے ہیں دم بدم کف افسوس برگ تاک

غنچے میں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
کرتی ہیں بلبلیں بھی فریاد دردناک

شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخل مغیلاں نہال ہوں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
ہو وے سر بہ چرخ بھی حوصلے عیم جہاں

کوئی بلا ہے خانۂ زندان یہ آسماں
چھٹنا محال اس سے ہے جبتک ہے تن میں جاں

جو آگیا ہے اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

اور اس جنگ آزادی میں حصہ لینے کی پاداش میں بہادر سید جعفر رنگون میں جلا وطنی کی زندگی گزار کر قید حیات اور قید فرنگ دونوں سے چھوٹ گئے۔

انگریز افسروں کے خطوط

خاندان مغلیہ کی حکومت کے آخری دور میں انگریزوں کی حیثیت بظاہر کمپنی محض مالگزاری وصول کرنے کی ٹھیکہ داری تھی۔ لیکن انگریزوں نے ملکی نظم کرنے ہی سے بچ کر یہاں اور ہر قسم کی سیاست شروع کردی۔ بادشاہ صرف پنشن خوار رہ گیا۔ لال قلعہ پر بھی پہرہ چوکی انگریزوں کا رہتا تھا۔ اور ہر قسم کا ملکی انتظام بھی انہوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ۱۱۔مئی ۵۷ء کو میرٹھ چھاؤنی کے سپاہیوں نے جب انگریزی افسروں کی حکم عدولی کی اور کچھ سپاہی اسلحہ لیکر دہلی کی طرف کوچ کردیا۔ تب یہ ہوئی کہ انگریزوں نے بہت سے ایسے کام کئے تھے جن کی وجہ سے بادشاہ کی رعایا ان سے ناراض ہوگئی تھی۔ اول تو لارڈ ڈلہوزی نے، جو کمپنی کی طرف سے گورنر جنرل تھا، بہت سی ہندوستانی ریاستوں کو ضبط کرلیا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی بڑی ریاست، اودھ، اور مرہٹوں کی ریاست، ستارا اسی گورنر جنرل نے ضبط کی تھی اور لوگوں کا عام طور پر خیال ہوگیا تھا کہ بس اب کوئی ریاست ضبطی سے نہ بچیگی۔ اس زمانے میں عیسائی پادریوں نے اپنے مذہب کا پرچار شروع کردیا تھا۔ اور بہت سے مشنری مدارس شروع سے لیکر بی۔اے تک جاری کردئے گئے تھے اور وہاں انجیل مقدس کا پڑھنا لازمی قرار دیدیا گیا تھا۔ ان باتوں سے عوام کو یہ خیال پیدا ہوگیا کہ یہ عیسائی مذہب پھیلانے کی کوششیں ہیں۔ اور عام مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی۔

پھر کمپنی کی حکومت بھی جابر اور سخت تھی۔ فوج کے سپاھیوں پر جو فوری اثر پڑا وہ چربی کے نئے کارتوس کا تھا۔ انہیں منہ سے کھولکر بندوق کی نال میں لگانا جاتا تھا ان کارتوسوں کے بارے میں ھرجگہ سپاھیوں کو یہ خیال ہوگیا ہے کہ ان میں ہمارا دین دھرم بگاڑنے کے لئے سؤر اور گائے کی چربی استعمال کی گئی ہے۔

یکم اپریل ۵۷ء کو ایک استہار اس مضمون کا جامع مسجد دھلی میں چسپاں کیا گیا تھا کہ ۱۱ مئی کو دھلی لوٹی جائے گی۔ اور بڑا کشت و خون ھوگا۔ چنانچہ میرٹھ کے سپاھیوں کا ایک گروہ صبح کے وقت ۷ بجے کشتیوں سے دریا کو پار کرکے شہر میں داخل ھوگا۔ ان میں کچھ سرے سوار تھے اور گیارہ ھندوستانی رجمنٹ کے پیدل اور بیس سوار تھے یہ لوگ ''سائمن فریزر'' ریزیڈنٹ کی کوٹھی میں گھس گئے۔ جو انگوری باغ میں قلعہ کے نیچے تھی۔ فریزر صاحب پر سپاھیوں نے حملہ کیا تو وہ براہ ثمن برج، قلعہ کے اندر چلے گئے اور دروازہ بند کرلیا۔ وھاں سے قلعہ کے لاھوری دروازہ پر گئے اور دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد میرٹھ کے ساتھی آئے اور صوبہ دار سے دروازہ کھلوا کر قلعہ کے اندر داخل ھوگئے کپتان ڈگلس اور فریزر صاحب نے مقابلہ کرنا چاہا لیکن قلعہ کی گارد نے ان کا حکم نہ مانا اور یہ قلعہ کی بیرونی طرف بھاگے۔ راستے میں سپاھی مل گئے اور انہوں نے دونوں کو مار ڈالا۔ بہت سے سپاھی دریا گنج کی طرف چلے گئے۔ جہاں زیادہ تر انگریزوں کے مکانات تھے وھاں انہوں نے آگ لگا دی۔ اس عرصے میں ایک اور انقلابی رجمنٹ آئی۔ پانچ انگریزوں اور دو مسلمانوں کو شہر کے مفسدوں نے مار ڈالا۔ لیکن جس قدر عیسائی تھے وہ سب راجہ کشن گڑھ کی کوٹھی میں جا کر پناہ گیر ھوگئے اور وہ محفوظ رہے۔ جب دریا گنج جل کر خاک ھوگیا تو وھاں سے یہ رجمنٹ سکنر کی کوٹھی گئی اور ان ھی سپاھیوں میں سے پانچ سوار چھاؤنی بھیجے اور وھاں کے سپاھیوں کو اپنے زمرہ میں شامل کرکے فرنگی افسروں کے بنگلوں

کو جلانا شروع کردیا۔ کچھ سوار اور سپاہی میگزین کی طرف
بڑھے۔ مگر وہ سب سپاہی اور تقریباً ایک ہزار شہری میگزین کے
پھٹنے سے اڑ گئے۔ یہ میگزین خود انگریزوں نے اڑایا تھا۔ لفٹننٹ
ویر۔ ڈبولی۔ شابکی۔ کرڈ اور دیگر فوجی افسران وہاں موجود
تھے اور جب انہوں نے دیکھا کہ میگزین ان کے قبضہ سے نکل
جائے گا تو انہوں نے اسکو اڑا دیا۔ اسکے بعد انقلابیوں کا قبضہ
شہر دہلی پر مکمل ہوگیا۔ اور انقلابیوں کے دوسو سوار گوڑگانواں
کی طرف گئے اور سرکاری خزانہ، جس میں ، لاکھ چوراسی ہزار روپیہ
تھا، لوٹ کر دہلی واپس آگئے اور اب دہلی اور گوڑگانواں کے
خزانہ کا کل روپیہ ملاکر تین لاکھ چوراسی ہزار روپیہ ہوگیا
جو بعد میں شاہی اور انقلابی سپاہیوں کی حراست میں رکھا گیا۔ اس
وقت دہلی میں تین رجمنٹیں ایک میرٹھ کی اور دو خاص دہلی کی
موجود تھیں۔ ان کے علاوہ دو سو سوار اور بھی تھے۔ باقی انقلابیوں
کی فوج علی گڑھ اور آگرہ کی طرف روانہ ہوگئی۔ لیکن انقلابی
سرسہ، ہانسی، روہتک کرنال وغیرہ کی طرف بڑھ گئے اور یہ
دہلی کی طرف انگریزوں کی کمک آنے کو روکا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جنرل سر ہنری برنارڈ نے جو اس وقت
کمانڈر انچیف تھا۔ صرف دو ہزار فوج سے دہلی کا محاصرہ کرنا شروع
کردیا تھا۔ اور انقلابیوں کے پاس کم ازکم سات ہزار فوج اس وقت
موجود تھی، چنانچہ ایک مراسلہ جنرل سر ہنری برنارڈ کمانڈر انچیف نے
جارج کارنک برس کے نام، جو دریائے ستلج کی مغربی ریاستوں کے
کمشنر تھے، ۲۱ جون ۵۷ء کو بھیجا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں
کہ: "ہر گھڑی مجھکو امید ہوتی ہے کہ ہماری توپیں دفعہ کی
دیواروں کی توپوں کو خاموش کرسکیں گی اور مجھے اس قابل بناسکتی
ہیں کہ دہلی کی معقول امید کے ساتھ قریب پہنچکر اس مقام
پر قبضہ کرلوں لیکن ان کی توپوں کی زیادتی میری ہمت پست
کئے دیتی ہے۔ بس اب (جیسا کہ واقعہ ہے) میرے سامنے ہے اور
مجھے کسی چیز کا خوف نہیں۔ سوائے اس کے اور کوئی تدبیر

فوراً لوٹ لیے۔ یہ سب روپیہ سپاہیوں کے قبضہ میں رہتا اور خزانہ شاہی میں ایک حبہ داخل نہ ہوتا۔ بعض رجمنٹوں کے پاس اس قدر روپیہ جمع ہوگیا تھا کہ وہ بمشکل حرکت کرسکتی تھیں۔

بادشاہ کا حکم شاذ و نادر ہی مانا جاتا تھا۔ اور شہزادوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ سپاہ بالکل بے سری ہوگئی تھی۔ نہ بخت کو مانتے تھے نہ افسروں کی سنتے تھے اور نہ ایسا منظم کام انجام دے سکتے تھے۔ فوج کی کمی تو ایک طرف رہی، کبھی وردی بھی نہیں پہنی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کیا کامیابی کی امید ہوسکتی تھی۔ اگرچہ فوجی سامان کی کمی نہ تھی اور بڑے والے بھی بہت تھے لیکن کمی صرف نظم و تربیت کی تھی اور یہی حال کانپور اور لکھنؤ وغیرہ کا بھی تھا۔ اگر سب یہ محسوس کرتے کہ کمپنی کی بجائے بادشاہ کی حکومت رہے گی اور کمپنی کی ٹھیکہ داری موقوف ہوگی تو لوگوں اور خود انگریزوں کو یقین ہوجاتا کہ یہ ضرور ہوکر رہے گا۔ پھر سب اس جنگ آزادی میں شریک ہوجاتے اور انگریزوں کی مدد نہ کرتے۔

ایک مراسلہ سرجان لارنس چیف کمشنر پنجاب نے جارج کارنک بارنس کو ۱۱۔ اکتوبر ۵۷ء کو بھیجا تھا جس میں لکھا تھا۔ طوفان ختم ہوگیا اور ہمیں سانس لینے کی فرصت ملی۔ یقیناً یہ بات ہماری توقعات سے زیادہ نکلی کہ تمام پنجابی سپاہی وفادار رہیں۔ پٹیالہ، نابھہ اور جیند کے لئے جو انعامات ہمیں تجویز کرنے چاہئیں۔ ان پر ذرا اپنے ذہن میں غور و خوض کرلیجئے۔ انہیں ضرور انعام و اکرام چاہئے۔ اگر وہ وفاداری نہ کرتے تو ہم کہاں کے رہتے؟

—*—

غالب کے مکاتیب

(مولانا غلام رسول مہر)

سرزمین پاک و ہند میں انگریزوں کی حکمرانی کا سنگ بنیاد پلاسی کے میدان میں رکھا گیا۔ بعد ازاں قریباً نوے برس میں یہ اجنبی حکومت پورے ملک پر مسلط ہوگئی اور مزید سو برس تک عنان فرمانروائی اسی کے ہاتھ میں رہی۔ اس عہد کا ایک بہت اہم واقعہ ۱۸۵۷ء کا وہ ہنگامہ ہے جسے اہل وطن ابتدا ہی سے ''جنگ آزادی،، قرار دیتے رہے۔ لیکن خود انگریزوں نے اسے ''غدر،، کا نام دیا۔ یہی نام مدت تک تاریخ کی درسی کتابوں میں استعمال ہوتا رہا۔

مرزا غالب نے اپنی فارسی اور اردو تصنیفات نظم و نثر میں اس واقعے پر جو کچھ لکھا اگر اسے ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا جائے تو یقین ہے کہ ایک ضخیم جلد تیار ہوجائے۔ فارسی نثر کی ایک کتاب جس کا نام ''دستنبو،، ہے صرف اسی واقعہ سے متعلق ہے۔ لیکن میں آج جو نقشہ آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ محض مرزا کے مکاتیب سے جستہ جستہ اقتباسات لے کر تیار کیا ہے۔

تمہید کے طور پر عرض کردینا چاہئے کہ اس ہنگامے کا آغاز ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو پیر کے دن ہوا تھا۔ چار مہینے اور چار دن انگریز شہر سے بے دخل رہے۔ ۲۰۔ ستمبر ۱۸۵۷ء

کو وہ دوبارہ دہلی میں داخل ہوئے۔ ۱۸۔ ستمبر کو شہر مکمل طور پر ان کے قبضے میں آگیا۔ مرزا اس پوری مدت میں ایک دن کے لئے بھی شہر نہ نکلے۔ ان کا محلہ بلی ماراں تھا جو جہاں شریف خانی حکیموں کے مکانات تھے۔ اس خاندان کے بعض افراد سرکار پٹیالہ میں ملازم تھے۔ جب انگریزی فوج دوبارہ دہلی میں داخل ہوئی تو اہل شہر گھر بار چھوڑ کر دہلی دروازے ترکمان دروازے اور اجمیری دروازے سے باہر نکل گئے۔ بلی ماراں کے دروازے پر والئ پٹیالہ نے شریف خانی خاندان کی حفاظت کے لئے اپنا پہرہ بٹھا دیا تھا۔ اس طرح مرزا کی حفاظت کا بھی بندوبست ہو گیا۔ ورنہ انہیں گھر بار چھوڑ کر شہر سے نکلنا پڑا۔

مرزا کے مکاتیب میں اس واقعے کے متعلق سب سے پہلی تحریر نومبر ۱۸۵۷ء کی ہے جب کہ انگریز شہر پر قابض ہو چکے تھے۔ حکیم غلام نجف کو لکھتے ہیں:

"میاں حقیقت حال اس سے زیادہ نہیں کہ اب تک جیتا ہوں۔ بھاگ نہیں گیا۔ نکالا نہیں گیا۔ لٹا نہیں۔ کسی محکمے میں اب تک بلایا نہیں گیا۔ معرض باز پرس میں نہیں آیا۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے"

پھر ۹۔ جنوری ۱۸۵۸ء کو تحریر فرماتے ہیں:

"خدا کا شکر ہے۔ اس وقت تک مع عیال و اطفال جیتا ہوں۔ بعد گھڑی بھر کے کیا ہو کچھ معلوم نہیں۔ قلم ہاتھ میں لئے بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر لکھ نہیں سکتا۔ اگر مل بیٹھنا قسمت میں ہے تو کہہ لیے ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون"۔

یہ بظاہر چند فقرے ہیں جن میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ لیکن صاف ظاہر ہے کہ اس وقت حالات کیسے نازک تھے اور بے بسی کس حد تک پہنچی ہوئی تھی۔

یہ ہنگامہ در حقیقت ایک خوفناک زلزلہ تھا جس نے

سب کچھ تہہ و بالا کر دیا۔ جس ماحول میں مرزا نے اپنی زندگی کے ساٹھ برس گزارے تھے اس کی بساط لپٹی جا چکی تھی۔ اور اس کی جگہ بالکل نیا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ مرزا کے دل پر اس وسیع اور ہمہ گیر انقلاب کا بہت گہرا اثر تھا۔ وہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے دور اور بعد کے دور کو دو الگ الگ جنم سمجھنے لگے تھے۔ گویا جیسے کہ ہندوؤں کے طریق عقیدے کے مطابق ان کی زندگی کا ایک جنم ختم ہو گیا تھا، اور دوسرا جنم وجود میں آ گیا تھا۔ اپنے عزیز ہندو شاگرد ہرگوپال تفتہ کو تحریر فرماتے ہیں :

"صاحب۔ تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان لکھے اس زمانے میں ایک بزرگ تھے اور ہمارے تمہارے دلی دوست تھے۔ منشی نبی بخش ان کا نام اور "حقیر" ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا نہ وہ اشخاص۔ نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے۔ یعنی ایک خط میں نے منشی صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب آیا۔ ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو، آیا اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی اور اس محلے کا نام بلی ماراں کا محلہ۔ لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں سے نہیں پایا جاتا"۔

میں عرض کرچکا ہوں کہ انگریزی فوج کے داخلے کے ساتھ ہی اہل شہر باہر نکل گئے تھے۔ اور پورا شہر بے چراغ ہوچکا تھا۔ انگریزوں نے اس کے بعد شہر کو دوبارہ آباد کرنے کا سلسلہ شروع کردیا۔ مرزا فرماتے ہیں : "مسلمانوں کے جتنے امیر غریب سب نکل گئے جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہل حرفہ کوئی بھی نہیں۔ مفصل لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ملازمان

قلعہ پر شدت ہے۔ بازپرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں،،۔
پھر فرماتے ہیں :

''میں مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پائے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم (۱۱) مئی سے آج تک یعنی پنجشنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھکو نہیں معلوم،،۔

مرزا کے ایک شاگرد منشی شیونرائن ''آرام،، نے آگرے سے ایک اخبار نکالا تھا۔ مرزا سے استدعا کی کہ اس کے لئے خریدار بہم پہنچائیے۔ جواب میں فرماتے ہیں :

''یہاں آدمی کہاں ہیں کہ اخبار کے خریدار ہوں۔ مہاجن لوگ جو یہاں بستے ہیں وہ یہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں کہ گیہوں کہاں سستے ہیں۔ بہت سخی ہوگئے تو جنس پوری دے دیں گے۔ کاغذ (یعنی اخبار) روپیہ مہینے کا کیوں مول لیں گے،،

میر مہدی مجروح نے اسی زمانے میں ایک غزل بھیجی اس کے مقطع کا آخری مصرع یہ تھا :

''میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے،،

اس مصرع نے مرزا کے سارے درد کو ہر بار ہلا دیا۔ فرماتے ہیں :

''اے میر مہدی۔ تجھے شرم نہیں آتی ''میاں یہ اہل دہلی کی زبان ہے،،۔

''ارے، اب اہل دہلی ہندو ہیں یا اہل حرفہ ہیں۔ خاکی ہیں یا پنجابی ہیں یا گورے ہیں ان میں سے تو کس کی تعریف کرتا ہے .... اے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں۔ دلی کہاں واللہ اب شہر نہیں ہے۔ کیمپ ہے۔ چھاؤنی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر،،

نواب علاؤالدین خان کو لکھتے ہیں :

قلعہ' نا مبارک سے قطع نظر کرکے اہل شہر کو گنتا ہوں۔ مظفر الدولہ میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ، میرا بھانجا، اس کا بیٹا احمد مرزا، انیس بیس برس کا بچہ، مصطفے خان ابن اعظم الدولہ اس کے دو بیٹے ارتضیٰ خان اور مرتضیٰ خان، قاضی فیض اللہ ۔ کیا میں ان کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا ؟ اے لو بھول گیا حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکش، اللہ اللہ ۔ ان کو کہاں سے لاؤں۔ غم فراق : حسین مرزا یوسف مرزا میر سرفراز حسین میرن صاحب۔ خدا ان کو جیتا رکھے ۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے خوش ہوتے ۔ گھر ان کے بے چراغ وہ خود آوارہ ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے ۔ ان اموات کے غم اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ ہوتا ہے ۔ یہاں اغنیا و امرا کے اولاد و ازدواج بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں،، ۔

مرزا کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ کوئی واقعہ پیش آجاتا تو ان کے دل میں جنگ آزادی کے بعد کا دور مصائب تازہ ہوجاتا ۔ ان کے شاگرد مرزا تفتہ نے اپنی کتاب ''سنبلستان،، چھپوائی ۔ اس کی لکھائی چھپائی اچھی نہ تھی ۔ مرزا نے اس واقعے کو بیگمات قلعہ کی مصیبتوں اور : بد حالیوں پر آنسو بہانے کا بہانہ بنالیا ۔ فرماتے ہیں :

''اجی مرزا تفتہ تم نے اپنا روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے۔ اس کاپی کی مثال جب تم پہ کھلتی کہ تم یہاں ہوتے ۔ اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے ۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے پائینچے لیر لیر۔ جوتی ٹوٹی ۔ یہ مبالغہ نہیں ،، ۔ اس وقت کے انگریزوں کی دماغی حالت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہوسکیگا کہ انہوں نے جامع مسجد کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا ۔ اور اس کے دروازوں پر ایک سکھ بٹالین کا پہرہ بٹھا دیا تھا ۔ ایک مرتبہ یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی کہ اسے گرجا بنالیا

جائے۔ جنگ آزادی سے قریباً پانچ برس بعد مسجد وا گزار ہوئی۔

مرزا نے ایک عجیب عبرت افزا واقعہ لکھا ہے۔ جن مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط ہوئی تھیں ان میں ایک حافظ محمد بخش تھے جن کا عرف ''ممون،، تھا۔ بعد میں وہ بے قصور ثابت ہوئے اور جائیداد کی بحالی کا حکم مل گیا۔ انہوں نے کچہری میں درخواست دی کہ میری جائیداد پر قبضہ دلایا جائے۔ انگریز حاکم نے نام پوچھا۔ عرض کیا محمد بخش۔ چونکہ درخواست میں عرف بھی درج تھا اس لئے حاکم نے پوچھا ''ممون،، کون ہے؟ عرض کیا کہ نام میرا محمد بخش ہے۔ لوگ مجھے ''ممون، ممون،، کہہ کر پکارتے ہیں۔ صاحب نے سن کر فرمایا:

''یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم۔ حافظ ممون بھی تم۔ سارا جہان بھی تم جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مسل داخل دفتر ہوئی۔ میاں ممون اپنے گھر چلے آئے،،۔

آخر میں جنگ آزادی کے متعلق مرزا کا ایک قطعہ لکھتا ہوں جو انہوں نے اپنے ایک دوست کو خط ہی میں لکھا تھا۔ یہ ان کے مکاتیب میں چھپ گیا اور دیوان میں شامل نہ ہوسکا:

بسکہ فعال ما یرید ہے آج
ہر سلح شور انگلستان کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا

چوک جسکو کہیں وہ مقتل ہے
گھر نمونہ بنا ہے زنداں کا

شہر دہلی کا ذرہ ذرۂ خاک
تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک
آدمی واں نہ جاسکے یاں کا

میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا
وہی رونا تن و دل و جاں کا

گہ جل کر کیا کئے شکوہ
سوزش داغ ھائے پنہاں کا

گہ رو کر کہا کئے باہم
ماجرا دیدہ ھائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یا رب
کیا مٹے دل سے داغ ھجراں کا

—*—

(ریڈیو پاکستان کے شکریہ کے ساتھ)

ادارۂ مطبوعات پاکستان ، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی